ماهنامه

لاهور

حکمتِ قرآن

مدیر مسئول :

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاهور

فون: ۸۵۲۶۱۱

اِن شاء اللہ العزیز

حکمتِ قرآن

کا آئندہ شمارہ جو مارچ اور اپریل کی "اشاعتوں" کے قائم مقام ہوگا ایک

اشاعتِ خصوصی

پر مشتمل ہوگا۔ جس میں ایک نہایت اہم مقالہ

ڈاکٹر اسرار احمد

کا ——— بعنوان

فرائضِ دینی کا قرآنی تصوّر

اور ایک اہم مضمون ایک صاحبِ خیر کا بعنوان

"قدرت کے طبعی و تمدّنی قوانین اور اسلام و ایمان"

شامل ہوں گے

اور یہ اشاعت اُن صاحبِ خیر کی جانب سے معتد بہ تعداد میں صاحبِ ضرورت حضرات کو ہدیۃً پیش کی جائے گی ——— لہٰذا قارئین "حکمت قرآن" سے درخواست ہے کہ وہ جن حضرات کو یہ اشاعت ارسال کرانا چاہیں ان کے پتے دفتر "حکمتِ قرآن" کو ارسال ——— کر دیں ———

المعلن: منیجر ماہنامہ "حکمتِ قرآن"، ۳۶ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے پی۔ ایچ ڈی۔ ڈی لٹ (مرحوم)

ربیع الثانی ۱۴۰۳ھ
بمطابق
فروری ۱۹۸۳ء

جلد اوّل
شمارہ ۱۲

مدیر اعزازی
ڈاکٹر ابصار احمد
ایم اے۔ ایم فل۔ پی ایچ ڈی

معاون مدیر
حافظ عاکف سعید
ایم اے (فلسفہ)

فہرس

حرفِ اوّل ——— ۲
ابصار احمد

الٓمٓ (ابتدائی تعارف) ——— ۳
ڈاکٹر اسرار احمد

علامہ اقبال اور کتاب زندہ ——— ۹
پروفیسر مرزا محمد منوّر

دَورِ حاضر میں مذہبی واردات کا مسئلہ ۱۷
چوہدری مظفر حسین

ادراکِ حقائق میں عقل کی درماندگی ——— ۲۴
مولانا الطاف الرحمٰن بنوی

مروّجہ نظام زمینداری اور اسلام ۳۰
مولانا محمد طٰسین

یکے از مطبوعات: مرکزی انجمن خدّام القرآن، لاہور۔ ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن لاہور

زرِ سالانہ - ۲۰/- روپے قیمت فی شمارہ: ۲/- روپے

طابع: ایس اے سلیم مطبع: آفتاب عالم پریس لاہور

ڈاکٹر ابصار احمد

حرفِ اوّل

فروری کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم حسبِ وعدہ اس ماہ کا شمارہ بھی جنوری کے شمارے کی طرح بروقت شائع کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

زیرِ نظر شمارے میں مولانا محمد طاسین صاحب کے مضمون کی دوسری قسط پیش کی جا رہی ہے۔ اس قسط میں تمہیدی بحث اختتام کو پہنچتی ہے اور آئندہ قسط میں معین طور پر مزارعت کا موضوع زیرِ بحث آئے گا۔ ہمیں مولانا کی جانب سے اس مضمون کی اقساط باقاعدگی سے موصول ہو رہی ہیں۔ توقع ہے کہ ان مضامین کے ذریعے مولانا کا نقطہ نظر اور ان کی تحقیق پوری شرح و بسط اور تفصیل و وضاحت کے ساتھ قارئین کے سامنے آئیں گے ——— "الٓمٓ" کے عنوان سے ایک نیا سلسلۂ مضامین ہم اس ماہ شروع کر رہے ہیں۔ مضامین کا یہ سلسلہ دراصل ڈاکٹر صاحب کے ان مختصر خطابات پر مشتمل ہے جو دو سال قبل رمضان المبارک کے دوران ٹیلیویژن پر نشر ہوئے تھے۔ ان خطابات میں قرآن مجید کی وہ ۲۹ سورتیں زیرِ درس آئی ہیں جن کا آغاز حروفِ مقطعات سے ہوا ہے۔ اس شمارے میں اس سلسلے کا تمہیدی خطاب شامل ہے۔

قارئین کے لئے یہ خبر یقیناً باعثِ مسرت ہو گی کہ انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام گزشتہ دو سالوں کی طرح امسال بھی محاضرات کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ یہ محاضرات انشاء اللہ اپریل کے پہلے ہفتے میں منعقد ہوں گے۔ ان میں پاکستان کے علاوہ ہندوستان سے بعض مشاہیر علماء کی شرکت متوقع ہے۔ جو قرآن حکیم کے جملہ مضامین اور اس کی دعوت پر علمی مقالات پیش کریں گے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ دینِ متین کی خدمت کے سلسلے میں انجمن کی یہ مساعی بارآور ہوں۔ اور قرآن کی دعوت زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچ سکے۔ آمین ثم آمین۔

نشری (ٹی وی) تقاریر

ڈاکٹر اسرار احمد

الٓمّٓ

(ابتدائی تعارف)

نَحمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُولِہِ الکَرِیمْ اما بعد
فاعوذ باللہ من الشیطٰنِ الرجیم بسم اللہِ الرحمٰنِ الرحیم

ناظرین کرام - السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'
گزشتہ دو سالوں کے دوران ماہ رمضان المبارک میں الکتاب کے عنوان سے آپ نے جو پروگرام ملاحظہ فرمایا اس میں قرآن کریم کے مضامین پر گفتگو پاروں کی تقسیم پر مبنی تھی - اس سال یہ فیصلہ کیا گیا کہ گفتگو قرآن مجید کی سورتوں کی بنیاد پر ہو- واضح رہے کہ قرآن مجید کی اصل اکائی آیات ہیں اور قرآن حکیم ساڑھے چھ ہزار کے لگ بھگ آیات پر مشتمل ہے - آیت کے معنیٰ ہیں نشانی - گویا کہ اس سے اشارہ ہے اس حقیقت کی طرف کہ قرآن حکیم کی ہر آیت اللہ تعالےٰ کے علم کامل اور حکمتِ بالغہ کی ایک درخشاں نشانی ہے - یہ آیات سورتوں کی شکل میں جمع ہیں - سورتیں بڑی بھی ہیں اور چھوٹی بھی - عربی زبان میں "سورہ" فصیل کو کہتے ہیں - اس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن حکیم کی ہر سورہ اللہ کے علم وحکمت اور ہدایت ومعرفت کا ایک شہر ہے - جس کے گرداگرد فصیل کھچی ہوئی ہے - قرآن مجید میں کل ۱۱۴ سورتیں ہیں اور ان میں سے ۲۹ سورتیں وہ ہیں جن کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے - چونکہ رمضان المبارک میں بھی یا ۳۰ یا ۲۹ دن ہوتے ہیں لہذا سورتوں پر گفتگو کی ابتداء میں ایک بات یہ مناسب نظر آئی کہ اس سال ہم ان سورتوں پر گفتگو کریں جن کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے - یہ حروف

مقطعات ایک ایک کی شکل میں بھی ہیں دو دو کے جوڑوں کی صورت میں بھی ہیں، تین بھی آئے ہیں، چار چار بھی آئے ہیں اور پانچ پانچ بھی آئے ہیں پانچ سے زیادہ حروف مقطعات کسی سورہ کے آغاز میں موجود نہیں ہیں۔

عربی زبان میں قطع یقطع کے معنیٰ ہیں کاٹنا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ ان حرف کو حروف مقطعات اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کو علیحدہ علیحدہ پڑھا جاتا ہے۔ الٓمٓ اس کو الٓم نہیں پڑھا جائے گا۔ کاٹ کر یعنی الف۔ لام۔ م پڑھا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں حروف مقطعات کہا گیا ہے۔ ان حروف کے بارے میں بعض اعداد و شمار بہت دلچسپ ہیں۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ قرآن حکیم کی ۲۹ سورتوں کا آغاز ان سے ہوا اور عربی زبان کے حروف تہجی کی تعداد بھی ۲۹ ہی ہے۔ مزید غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے نصف حروف ہیں کہ جو حروف مقطعات میں استعمال ہوئے ہیں یعنی ۱۴۔ پھر ایک اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ان حروف کے ۱۴ ہی سیٹ ہیں جو مختلف سورتوں کے آغاز میں آئے ہیں۔ ایک اور بات بھی بڑی معنی خیز ہے کہ اگر عربی زبان کے حروف ہجا کی تختی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جائے پہلا حصہ ۹ حروف پر مشتمل، دوسرا حصہ ۱۰ پر اور آخری اور تیسرا پھر ۱۰ پر، تو پہلے حصے کے ۹ حروف میں سے صرف ۲ استعمال ہوئے ہیں ۷ حروف استعمال نہیں ہوئے۔ آخری حصے میں معاملہ بالکل برعکس ہے ۱۰ میں سے ۷ حروف، حروف مقطعات وارد ہوئے ہیں، ۳ نہیں آئے۔ درمیان کے ۱۰ حروف دو دو حرفوں کے جوڑوں پر مشتمل ہیں۔ جن میں سے ایک ایک حرف بغیر نقطے کے ہے اور دوسرا حرف نقطے والا ہے۔ ان حروف مقطعات میں صرف وہ حروف استعمال ہوئے ہیں کہ جو بغیر نقطے کے ہیں۔ را ہے زا نہیں ہے، س ہے ش نہیں ہے، ص ہے ض نہیں ہے، ط ہے ظ نہیں ہے، ع ہے غ نہیں ہے۔ ایک اور حقیقت جس کی طرف ماہرین تجوید نے توجہ دلائی وہ یہ کہ عربی زبان کے حروف مخارج کے اعتبار سے جتنی قسموں پر مشتمل ہیں ان سب میں سے نصف تعداد ان حروف مقطعات میں استعمال ہو گئی۔ یہ اعداد و شمار خواہ ان کی کوئی (SIGNIFI-CANCE) اہمیت ابھی ہمارے علم میں نہ آئی ہو لیکن ہمارا یقین ہے کہ اللہ کے کلام میں کوئی چیز بھی (AT- RENDUM) نہیں ہے یعنی بغیر حکمت کے نہیں ہے۔ یقیناً

ان میں بھی کوئی حکمت ہے اور اگر آج نہیں تو کل اس کے رمز کی طرف بھی انشاء اللہ العزیز انسان کی رہنمائی ہو جائے گی ۔ جہاں تک ان حروف مقطعات کے معنی و مفہوم کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ایک بات تو یہ جان لینی چاہیئے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب میں اپنے کلام کا آغاز حروف مقطعات سے کرنا ایک معروف اور معلوم اسلوب تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو یقیناً قرآن مجید پر اعتراض کیا جاتا اور یہ معلوم ہے کہ قرآن مجید پر ایسا کوئی اعتراض کبھی نہیں کیا گیا ۔ گویا کہ یہ اہل عرب کے ہاں ایک معروف اور پہچانا ہوا اسلوب تھا البتہ جہاں تک ان کے معنیٰ کا تعلق ہے ، واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ بہت سے محققین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس میدان میں عقل و خرد کے گھوڑے دوڑائے ہیں ۔ لیکن جس بات پر اُمّت کا تقریباً اجماع ہے وہ یہی ہے کہ ان کا کوئی حتمی اور یقینی مفہوم کسی کو معلوم نہیں سوائے اللہ کے اور اسکے رسُول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ۔ گویا کہ یہ ایک راز ہے اللہ اور رسُول کے مابین ۔ اگر نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان حروف کے معنیٰ کے بارے میں کوئی بات مرفوعاً منقول ہوتی تو ظاہر بات ہے کہ پھر کسی اور چھان بین کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس ضمن میں کوئی بات مرفوعاً منقول نہیں ۔ البتہ صحابہ میں سے بعض نے وجدانی اور اذعانی طور پر بعض آرا کا اظہار کیا ہے ان میں سے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما اس اعتبار سے بہت اہمیت کے حامل ہیں کہ انہیں اُمت نے بھی حبرالامۃ کا خطاب دیا یعنی اُمت کے بہت بڑے عالم اور ان کے حق میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی دُعا فرمائی تھی کہ اللّٰھم فقھہ فی الدین "اے اللہ اس (نوجوان) کو دین میں سمجھ عطا فرما" ان کا کہنا یہ ہے کہ حروف مقطعات پورے پورے جملوں کا ملخص یا مخفف ہیں ۔ مثلاً ان کے نزدیک الٓمّ سے مراد "اَنَا اللہ عَالِمٌ" ہے ۔ یعنی میں اللہ ہوں اور علم رکھتا ہوں ۔ یہ جملہ جو تین الفاظ پر مشتمل ہے تو پہلے لفظ کا پہلا حرف الف لے لیا گیا ہے ۔ اور درمیانی لفظ سے درمیانی حرف لے لیا گیا یعنی اللہ سے ل ۔ اور آخری لفظ سے آخری حرف لے لیا گیا ۔ یعنی عالم سے م ۔ تو اَنَا اللہ عالم کا مخفف الٓمّ ۔ ہوا ۔ اسی طرح انکی رائے یہ ہے کہ "الٓرا" کے معنی ہیں اِنَّ اللہ اراٗ "المرا" ان اللہ عالم و ارا ۔ وقس علے ذالک ۔

لیکن یہ بات بھی، اگرچہ یہ قول ہے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالےٰ عنہما کا لیکن چونکہ اس کے لئے بھی کوئی دلیل موجود نہیں - یہ خالص وجدانی بات ہے لہٰذا اُمّت نے بالعموم اسے بھی قطعیت کے ساتھ تسلیم نہیں کیا - حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ ہر کتاب کا ایک راز ہوتا ہے اور قرآن مجید کا راز اسکے حروف مقطعات ہیں - اسی کے ہم معنی ایک قول حضرت علی رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے بھی منقول ہے البتہ اہل نحو نے ایک رائے دی ہے اور ان کی اکثریت کا رجحان اس جانب ہے کہ یہ سُورتوں کے نام ہیں - اس لئے کہ بہت سی سورتیں انہی حروف مقطعات سے موسوم ہیں - جیسے سُورہ یٰسٓ، سُورہ طٰہٰ، سُورہ قٓ، سُورہ نٓ - لیکن چونکہ بہت سے حروف کا معاملہ یہ ہے کہ وہ متعدد سُورتوں کے آغاز میں آئے ہیں، مثلاً الٓمٓ سے ۶ سورتوں کا آغاز ہوتا ہے تو یہاں یہ بات درست نہیں بیٹھتی اس لئے کہ نام کا جو اصل مقصد ہے وہ فوت ہو جاتا ہے اگر بہت سی سُورتوں کے نام ایک ہی ہوں - بعض حضرات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ اللہ کے اسماء ہیں بہرحال یہ تمام باتیں محض وجدان اور اذعان پر مبنی ہیں ان میں سے کسی کیلئے بھی کوئی حتمی دلیل کسی کے پاس موجود نہیں ہے - عہد حاضر میں ان حروف مقطعات کے بارے میں دو رائیں بہت دلچسپی کی حامل سامنے آئی ہیں -

ایک رائے مولانا حمیدالدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے - انہوں نے یہ فرمایا کہ عربی زبان کے حروف عبرانی زبان سے ماخوذ ہیں اور جس طرح چینی زبان اور قدیم مصری زبان کے حروف تہجی مختلف شکلوں پر دلالت کرتے تھے - اور ان کے اندر ان شکلوں کے معنیٰ پائے جاتے تھے - مثلاً ج کو عبرانی میں جمل کہتے ہیں اور جمل کے معنی اونٹ ہیں اور ج کو اسی شکل پر لکھا جاتا ہے جیسے اونٹ کی گردن اور اس کے ساتھ اس کا سر ملا ہوا ہو - ب کو یا با کو عبرانی میں بیت کہتے ہیں اور بیت کے معنی گھر ہیں - اور با سے عبرانی زبان میں گھر ہی مراد لیا جاتا تھا - اسی طرح ط جسے ہم عربی میں طا کہتے ہیں یہ سانپ سے ماخوذ ہے اور اس کو اسی طرح لکھا جاتا ہے کہ جیسے پھنیر سانپ ہو اور اس نے اپنا پھن کھڑا کیا ہوا ہو اور نیچے کنڈلی موجود ہو اب یہ بات بڑی دلچسپ ہے

کہ قرآن حکیم میں جن سورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر تفصیلاً آیا ہے انکے آغاز میں حروف مقطعات میں ط ہمیں ملتا ہے اور ان سب میں ذکر ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزے کا کہ ان کا عصا ایک سانپ کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ سورہ طٰہٰ، طٰسٓمٓ۔ ان سورتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات تفصیلاً آئے ہیں اور ان سب کے شروع میں ط موجود ہے۔ اسی طرح نٓ کے بارے میں مولانا فراہیؒ کی تحقیق یہ ہے کہ اس کے معنی عبرانی میں مچھلی کے تھے اور اس کو لکھا بھی اسی طرح جاتا تھا کہ قوس کی شکل کا خط اور اس کے ایک کنارے پر ایک نقطہ۔ آج بھی کسی خلکے میں جب مچھلی کی شکل بنائی جاتی ہے تو اسکی صورت یہی ہوتی ہے کہ ایک خمدار ساخط ہو اور اس کے ایک طرف ایک نقطہ ہو کہ جو مچھلی کی آنکھ کی طرف اشارہ کر رہا ہو۔ قرآن مجید میں بھی ایک مقام پر حضرت یونس علیہ السلام کو "ذوالنون" کہا گیا ہے۔ یعنی "مچھلی والے" اس لئے کہ ان کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا تھا کہ انکو مچھلی نے نگل لیا تھا۔

قرآن حکیم میں جس سورہ مبارکہ کا آغاز حرف ن سے ہوا ہے اس کے آخیر میں حضرت یونس علیہ السلام کا ذکر آیا ہے صاحب الحوت کے الفاظ سے — اس کے معنی ہیں مچھلی والے — اس میں بھی ایک مناسبت موجود ہے لیکن ظاہر بات ہے کہ یہ بھی ایک ابتدائی سی رائے ہے جب تک کہ تمام حروف مقطعات کو اس طرح حل نہ کیا جائے، اس رائے میں بھی کچھ بہت زیادہ وزن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بالکل حال ہی میں ایک رائے کمپیوٹر کے ایک مصری ماہر وشاد خلیفہ صاحب نے پیش کی ہے ان کے سامنے اتفاقاً یہ بات آئی کہ قرآن حکیم میں ۱۹ کا ہندسہ بہت اہم ہے۔ آیت بسم اللہ ہر سورہ کے آغاز میں ہے اور اس کے حروف کی تعداد ۱۹ ہے اور ان کے مشاہدہ میں یہ بات آئی کہ جن حروف سے کسی سورت کا آغاز ہوتا ہے اگر غور کیا جائے اور گنا جائے تو اس سورۃ میں وہ حرف ۹ مرتبہ ہوگا یا کسی اور عدد کا حاصل ضرب اتنی تعداد میں ہوگا۔ مثلاً سورہ نٓ میں حرف نٓ ۱۳۳ مرتبہ آیا ہے سورہ قٓ میں حرف قٓ ۵۷ مرتبہ آیا ہے یہ دونوں عدد ۱۹ سے تقسیم ہو جائیں گے۔ اس طرح گویا کہ یہ قرآن مجید کی حفاظت کا ایک ریاضیاتی نظام ہے جس کی طرف حال ہی میں انسان کی توجہ مبذول

ہوتی ہے۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ایک فرمان ہے قرآن حکیم کے بارے میں کہ "لا تنقضی عجائبہٗ"۔ اس کے عجائب کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں اور بھی بہت سے ایسے نکات سامنے آئیں کہ جن کی طرف ماضی میں اہل علم کی نگاہ نہ گئی ہو۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات۔

OOOOOO

بقیہ: 'دورِ حاضر میں مذہبی واردات کا مسئلہ'

لئے ضروری ہے کہ ہم لوگوں میں محبت کا داعیہ بیدار کریں۔ خدا کا خوف خدا کی محبت ہی کا ایک تقاضا ہے۔ لہٰذا اصلاح معاشرہ کا دیرپا اور مؤثر پروگرام وہی ہوگا جس میں نظام تعلیم کی اصلاح ان خطوط پر کی جائے گی جن کا ذکر علامہ اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین کے حوالے سے یہاں کیا گیا۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔

□□□□□□

بقیہ: 'مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام'

بلکہ دونوں کے اچھے پہلو اپنے اندر رکھتا ہے اور برے پہلوؤں سے پاک صاف ہے۔ گویا اسلام کے معاشی نظام کا ایک پہلو نظام سرمایہ داری میں اور ایک پہلو نظام اشتراکیت اور سوشلزم میں ہے۔ بہرحال جہاں تک جزوی مشابہت کا تعلق ہے وہ بعض پہلوؤں میں نظام سرمایہ داری اور نظام اشتراکیت کے مابین بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً دونوں لیبر یعنی محنت کو عامل پیداوار مانتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ دونوں الگ الگ اور مستقل نظام ہیں۔ اسی طرح اسلامی معاشی نظام بھی دوسرے نظاموں سے بعض جزوی مشابہتوں کے باوجود ایک جدا اور مستقل معاشی نظام

(جاری ہے)

علّامہ اقبال اور کتابِ زندہ

از قلم: پروفیسر مرزا محمد منوّر

آئینۂ قرآن کے حوالے سے اگر آدم خود بیں یعنی خود شناس ہو اور اپنی ذات سے آگاہی رکھتا ہو تو اسے یقین میسّر آجاتا ہے کہ اس کا مقام بہت ہی بلند ہے۔ اس باب میں علّامہ اقبال نے اپنی تائید گوئٹے سے بھی کرائی ہے۔ علّامہ لکھتے ہیں:—

"قرآنِ مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان گوناگوں روابط کا ایک علیٰ و برتر شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان ہیں۔ قرآنی تعلیم کا یہی وہ بنیادی پہلو ہے جس کے پیشِ نظر گوئٹے نے باعتبار ایک تعلیمی قوت اسلام پر من حیث الکل تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن (ECKERMAN) سے کہا تھا "تم نے دیکھا اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں، ہمارا کوئی نظام اور ہمیں پر کیا موقوف کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا"[1]

گمان یہی ہے کہ گوئٹے نے خود قرآن نہیں بلکہ اس کا ترجمہ پڑھا۔ اور اس کے باوجود اتنا متاثر ہوا۔ وہ اگر عربی قرآن یعنی فی الواقع قرآن پڑھتے اور اس کے مفاہیم کو براہِ راست سمجھنے پر قادر ہوتا تو اس کا دل زندہ نہ جانے اسے کیا سرشاری عطا کرتا، اس لیے کہ ترجمۂ قرآن خواہ کتنا ہی معیاری کیوں نہ ہو اصل "ء ب ی" مبین، کے بھرپور معانی کو اور پھر اس کے تناسبات اور آہنگ کے اثر کو قطعاً منتقل نہیں کرتا۔ — اس ضمن میں پروفیسر فلپ حتّی لکھتے ہیں:

"اسلوب قرآن اسلوب اعلیٰ ہے۔ بے نظیر، ناقابلِ تقلید، یہی اس کا سب سے بڑا معجزہ ہے، اس کی تجدید میں بڑی تاثیر ہے،

---

[1] تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، لاہور (بزمِ اقبال ۱۹۵۸ء) ص ۱۳

اس کا فنی جوہر اور جذبات کے تاروں کو ٹوڑ لینے والا پیغام ترجمے
کی صورت میں اپنا کمال کھو بیٹھتا ہے"۔ [۱]

ترجمہ بہرحال ترجمہ ہے، وہ قرآن نہیں، قرآن تو وہی ہے جو عربی زبان میں اُترا — یہ قرآن ہی ہے جو آدم کو جرأت آموز اور زندگی بخش پیغام سُناتا ہے کہ وہ نائب خدا ہے لہٰذا خدا کے بعد جملہ عناصر پر فرمانروائی اسی کی ہوگی، اسے بلندیوں، پستیوں، ہواؤں، بجلیوں، شعلوں، برفوں، طغیانیوں، جنّوں، عفریتوں، وحشی حیوانوں، اور درندوں نیز موسموں کے گوناگوں انقلابوں سے ہرگز نہیں گھبرانا چاہیئے، اس لیے کہ گو اس کا وجود بظاہر بڑا عاجز ہے مگر اس کے اندر رُوحِ خداوندی کا جو ذرّہٗ نُور ہے وہ مفتوح و مغلوب ہونے کے لیے نہیں آیا لہٰذا آدم کو اپنے اندر تغیّر اور انقلاب پیدا کرنا ہوگا، ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی خاطر اللہ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے کام لینا ہوگا — جی چاہتا ہے کہ "بالِ جبریل" کی نظم "رُوحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" ساری نقل کردی جائے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سُورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چُھپا دیکھ
ایامِ جُدائی کے سِتم دیکھ، جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں!
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں!!!
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے!

---

[۱] ISLAM — A WAY OF LIFE ص ۲۷، ۲۸۔

پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!
خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں
جچتے نہیں بخشے ہُوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!
نالندہ ترے عُود کا ہر تار ازل سے
تُو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تُو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے!
محنت کش، خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

پہلے دو بندوں میں کائنات کے مختلف مناظر و مظاہر دکھائے گئے ہیں تاکہ آدم فطرت کے کاروبار کا گہری نظر سے مطالعہ کرے۔ نیز آدم کو یہ خبر دی گئی ہے کہ تم ان عناصر پر قابض ہو جاؤ گے اور اس لیے قابض ہو جاؤ گے کہ اللہ نے تمہارے وجود میں وہ تمام جوہر ودیعت کر دیئے ہیں جو تمہیں حاکمیت کے قابل بناتے ہیں۔ طبعی موانع انسان کے عزم و ارادہ کی راہ نہیں روک سکتے، جان ڈیوی لکھتے ہیں:-

"Knowledge is power and knowledge is achieved by sending the mind to school of Nature to learn her process of change."[1]

(علم قوت ہے اور یہ قوت اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ ذہن کو مدرسۂ فطرت میں تربیت پانے کے لیے بھیج دیا جائے تاکہ اسے عمل تغیّر کا درس میسّر آجائے۔)

انسان کی بے پناہ صلاحیتوں کے اس مفہوم کو بالِ جبریل کی اشاعت سے قبل حضرت

---

۱ "Reconstruction in Philosophy" ص: ۴۹ (2nd Edition 1959)

اس کا فنی جوہر اور جذبات کے تاروں کو ٹٹولنے والا پیغام ترجمے کی صورت میں اپنا کمال کھو بیٹھتا ہے"۔ لہ

ترجمہ بہر حال ترجمہ ہے، وہ قرآن نہیں، قرآن تو وہی ہے جو عربی زبان میں اُترا — یہ قرآن ہی ہے جو آدم کو جرأت آموز اور زندگی بخش پیغام سناتا ہے کہ وہ نائب خدا ہے لہٰذا خدا کے بعد جملہ عناصر پر فرمانروائی اسی کی ہوگی، اسے بلندیوں، پستیوں، ہواؤں، بجلیوں، شعلوں، برفوں، طغیانیوں، جنّوں، عفریتوں، وحشی حیوانوں، اور درندوں نیز موسموں کے گوناگوں انقلابوں سے ہرگز نہیں گھبرانا چاہیئے، اس لیے کہ گو اس کا وجود بظاہر بڑا عاجز ہے مگر اس کے اندر روحِ خداوندی کا جو ذرۂ نور ہے وہ مفتوح و مغلوب ہونے کے لیے نہیں آیا لہٰذا آدم کو اپنے اندر تغیّر اور انقلاب پیدا کرنا ہوگا، ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کی خاطر اللہ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں سے کام لینا ہوگا — جی چاہتا ہے کہ "بالِ جبریل" کی نظم "روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" ساری نقل کردی جائے۔

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ!
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سُورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایامِ جُدائی کے سِتم دیکھ، جفا دیکھ!
بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ!

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں!
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں!!!
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے!

لہ ISLAM — A WAY OF LIFE ص ۲۷، ۲۸۔

پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ!
خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اِک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں
جچتے نہیں بخشے ہُوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ!
نالندہ ترے عُود کا ہر تار ازل سے
تُو جنسِ محبّت کا خریدار ازل سے
تُو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے!
محنت کش، خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

پہلے دو بندوں میں کائنات کے مختلف مناظر و مظاہر دکھائے گئے ہیں تاکہ آدم فطرت کے کاروبار کا گہری نظر سے مطالعہ کرے۔ نیز آدم کو یہ خبر دی گئی ہے کہ تم ان عناصر پر قابض ہو جاؤ گے اور اس لیے قابض ہو جاؤ گے کہ اللہ نے تمہارے وجود میں وہ تمام جوہر ودیعت کر دیئے ہیں جو تمہیں حاکمیت کے قابل بناتے ہیں۔ طبعی موانع انسان کے عزم و ارادہ کی راہ نہیں روک سکتے، جان ڈیوی لکھتے ہیں:-

"Knowledge is power and knowledge is achieved by sending the mind to school of Nature to learn her process of change." ۱؎

(علم قوت ہے اور یہ قوت اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ ذہن کو مدرسۂ فطرت میں تربیت پانے کے لیے بھیج دیا جائے تاکہ اسے عملِ تغیّر کا درس میسّر آجائے۔)

انسان کی بے پناہ صلاحیتوں کے اس مفہوم کو بالِ جبریل کی اشاعت سے قبل حضرت

۱؎ "Reconstruction in Philosophy" ص: ۴۹ (2nd Edition ۱۹۵۹)

علامہ اقبال نے اپنے "خطبات" میں بایں الفاظ بیان کیا تھا اور قرآن کی ضمانت دے کر بیان کیا تھا:

"جب اس کے گرد و پیش کی قوتیں اسے اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں تو وہ اُن کو جیسی چاہے شکل دے سکتا ہے۔ اور جس طرف چاہے موڑ سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا راستہ روک لیں تو اسے یہ قدرت حاصل ہے کہ اپنے اعماقِ وجود میں اس سے بھی ایک وسیع تر عالم طیار کر لے جہاں اس کو لاانتہا مسرت اور فیضانِ خاطر کے نئے نئے سرچشمے مِل جاتے ہیں۔ اس کی زندگی میں آلام ہی آلام ہیں اور اس کا وجود برگِ گل سے بھی نازک۔ بایں ہمہ حقیقت کی کوئی شکل ایسی طاقتور، ایسی ولولہ خیز، اور حسین و جمیل نہیں جیسی رُوحِ انسانی، لہذا باعتبار اپنی کنہ کے، جیسا کہ قرآن پاک کا ارشاد ہے، انسان ایک تخلیقی فعالیت ہے، ایک صعودی رُوح جو اپنے عروج اور ارتقاء میں ایک مرتبۂ وجود سے دوسرے میں قدم رکھتا ہے۔
" فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۙ وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ ۙ وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۙ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ؕ (سورۃ ۸۴، آیت ۱۶ تا ۱۹)
(ترجمہ آیات: میں قسم کھاتا ہوں شفق کی، اور رات کی اور ان چیزوں کی، جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جائے کہ تم کو ضرور ایک درجے یا حالت کے بعد دوسرے درجے یا حالت پر پہنچنا ہے[۱]

شفق کے بعد رات، اور رات کا احاطۂ غفلت، پھر بیداری اور نئی زندگی، چاند کا آغاز اور اس کی تکمیل — اللہ نے ان سب چیزوں کی قسم کھا کر کہا کہ تمہارا ارتقاء اور سفرِ حیات و رفعت جاری رہے گا، یہ کائنات محض تکرار نہیں۔ یہ بڑھتی ہوئی اور ہر لحظہ ترقی پذیر کائنات ہے، یہاں رکاؤ نہیں اور بالخصوص انسان وہ شے نہیں جسے ایک ہی حالت پر رہنا ہو۔ انسان کی ترقی کی راہ میں دُنیا کی ہر شے ممد ہے اور

---

[۱] تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۸۔

اس راہ کی سجاوٹ ہے۔ اس کی موت بھی زیادہ سے زیادہ نیند ہے جس کے بعد وہ تازہ دم ہو کر اُٹھے گا، اور مزید آگے کو بڑھے گا؛

اسی طرح قرآن حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ ایک دَور کے بعد دوسرا دَور آئیگا اور قرآن کے نزدیک ہر دَور کی حیثیت محض ساعات کی سی ہے، لہٰذا حاملِ قرآن یعنی فردِ مسلمان کو ہمت اور حوصلے سے یہ منازل طے کرنا چاہئیں۔ فردِ مسلمان کے فسانے اور زمانے بے حساب ہیں۔ وہ کسی ایک منزل پر نہیں رُک سکتا، وہ رُکے تو قرآن ایک نئی دنیا لا کے سامنے رکھ دیتا ہے اور اس کی تسخیر پر اُبھارتا ہے مگر یہ کتاب زندہ کسی صاحبِ ایمان کے دل زندہ کی طلب گار ہے ؎

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست !
عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست !
یک جہانش عصرِ حاضر را بس است
گیر اگر در سینہ دل معنیٰ رس است !
بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است
ہر جہاں اندر برِ اُو چوں قبا ست
چوں کہن گردد جہانے در برش !
می دہد قرآں جہانِ دیگرش !

(قرآن کی ایات میں سینکڑوں نئے جہانوں کے امکانات مضمر ہیں۔ قرآن کی ساعات و آنات میں کئی کئی زمانے لپیٹے اور تہ کیے ہوئے پڑے ہیں۔ اس کی آیات میں مضمر جہانوں میں سے فقط ایک جہان پورے عصرِ حاضر کے لیے کافی ہے، اگر سینے میں دل معنی یاب موجود ہے تو تُو اس مفہوم کو پالے، بندۂ مومن بھی اللہ کی آیات میں سے ایک آیت ہے، لہٰذا ہر جہان اس کے وجود کے لیے اس طرح موزوں ہے جس طرح قبا۔ کہنہ قبا کی طرح جب کوئی دنیا اس کے لیے پرانی ہوجاتی ہے تو قرآن کوئی نئی دنیا اس کے سپرد کر دیتا ہے،

ان اشعار میں "لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" کی ایک گونہ تشریح مل جاتی ہے۔ اس ضمن میں عباس محمود العقاد کا اقتباس ذیل بھی مفید مطلب رہبری کرتا ہے جو

نطشے کے قول پر مبنی ہے۔

"نطشے کا ایک قول ہے جو نہ جانے اس نے سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا ہے یا ازرہ مزاح اور وہ یہ ہے کہ انسان کی حیثیت بندر اور فوق البشر کے مابین پُل کی سی ہے۔۔۔۔ یہ قول متین ہو خواہ تمسخر ہو بہر صورت وہ پُل جو بندر کو فوق البشر میں منتقل کر دے، موجود نہیں، نہ ہو سکتا ہے۔ اس پُل کو نہ بندر تعمیر کرتا ہے نہ فوق البشر، اور نہ خود انسان اور نہ دستِ فطرت، اس لیے کہ فطرت تو (بقول نطشے) کبھی بلندیوں سے پستیوں کی طرف چل پڑتی ہے، اور کبھی پستیوں سے بلندیوں کا رُخ کر لیتی ہے، کوئی مقصد پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ ہاں جو کہنا مُراد ہے وہ یہ ہے کہ انسان زمین سے آسمان تک ایک پُل کی حیثیت رکھتا ہے، اور اس پُل کو تعمیر کرنے والا خدا ہے۔ اس پُل کی نیو اسفل السافلین ہے اور چوٹی اعلیٰ علیین ـــــ مٹی سے برآمد ہونے والا آدمی جس کی جبلّت میں ہے کہ رُوحانی اور عقلی آفاق کی جانب چڑھتا جائے۔ حسبِ ارشادِ ربّانی یٰاَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا فَمُلٰقِیْہِ (اے انسان تُو تو اللہ کی سمت محنت اور مشقت اُٹھاتا چلا جائے گا اور پھر اس سے جا ملے گا) وہ ضرور اللہ تک جا پہنچے گا، اس لیے کہ وہ حدیثِ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق خالق کی صورت میں تخلیق کیا گیا ہے۔۔۔۔ اس کی صورت سے مراد جسمانی صورت نہیں بلکہ صفات کے باب میں ہم صورت ہونا ہے ـــ اور وہ صفات ہیں رحمت، کرم، علم، عمل، مشیّت، مجد، عظمت، فتح، ابداع، انشاء (خلاقی) وغیرہ۔۔۔۔ اور یہ تمام اوصاف جن کا انسان سے مطالبہ کیا گیا انسان ان کو اپنانے پر بخوبی قادر ہے[1]

---

[1] حقائق الاسلام واباطیل خصومہ (بیروت: دارالکتاب العربی) ص ۱۳۱، ۱۳۲۔

اور یہ انسان کو پستیوں سے بلندیوں کی طرف لے جانے والا قرآن جسے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے اللہ کی وہ رسّی قرار دیا ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے " کِتَابُ اللّٰہِ ھُوَ الْحَبْلُ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَاءِ اِلَی الْاَرْضِ " یہی وہ رشتہ ہے جس سے محروم ہو کر انسان انسان نہیں رہتا اور اسفل السافلین میں جا گرتا ہے، اسی لیے تو حضرت علّامہ نے فرمایا تھا ؎

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست!
اعتصامش کن کہ حبلُ اللہ اوست
چوں گہر در رشتۂ اُو سُفتہ شو!
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو!

(ہم سراپا مٹّی ہیں اور قرآن دل ہے۔ دل بھی آگاہ، لہٰذا قرآن کو مضبوطی سے پکڑ لے۔ وہی اللہ کی رسّی ہے، تُو یا تو اپنے آپ کو قرآن کے رشتے میں موتی کی طرح پرو لے یا پھر ذرّۂ خاک کی طرح تتر بتر ہو جا)

— قرآن کو دل آگاہ قرار دینا توجّہ طلب امر ہے۔

آخر انسان کیوں بار بار گرتا ہے، اس باب میں انسان کو متنبہ کرنے کے لیے قرآن کریم زور دے کر کہتا ہے کہ ان اقوام کے عروج و زوال کا مطالعہ کرو جو تم سے پہلے ہو گزری تھیں۔ وہ قومیں تم سے زیادہ طاقتور تھیں اور آج ان کے آثار کبریائی میں سے محض دھندلے نقوش باقی ہیں تاکہ اولادِ آدم عبرت حاصل کرے، ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی واضح کر دیا کہ قوموں کے زوال کا سبب یہ نہیں کہ اللہ ایک خاص مدّت تک نعمت دے چکنے کے بعد اُن سے یونہی شوقاً اور شغلاً توجہ ہٹا لیتا ہے اور پھر اسی طرح شوقاً اور شغلاً کسی دوسری قوم کو نوازنے لگتا ہے۔ یہ بات نہیں، حق یہ ہے کہ انسان خود غافل ہو جاتا ہے۔ فکر و عمل کی دیانت سے اپنے آپ کو معرّیٰ کر لیتا ہے، دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے لگتا ہے، نیت میں خلل راہ پا لیتا ہے۔ اور اس کی پوری شخصیت کا رویّہ انسانی رویّے کے بجائے بہیمی اور حیوانی رویّہ بننے لگتا ہے۔ چنانچہ اس تدریجی، اور اندرونی زوال کے باعث اس میں قدرت و قوّت کی کمی نمودار ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کا رزق، اس کی فارغ البالی، اس کی آزادی اور اس کی شان رفتہ رفتہ رفت گذشت

ہو جاتی ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے :

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا
عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ

(سورۃ انفال، آیت ۵۳)

"اور یہ (کسب زوال وعتاب) یوں ہے کہ اللہ تو کسی بھی نعمت کو جو وہ کسی پر ارزانی کر چکا ہو نہیں بدلتا جب تک وہ لوگ خود اسے نہ بدل ڈالیں جو کچھ ان کے اندر ہے۔ یعنی جب تک وہ اپنی خصلت و سیرت خود نہ بگاڑ لیں۔"

مراد یہ ہے کہ انہوں نے حصولِ نعمت کے لیے اپنے اندر جو قابلیت پیدا کی تھی جب اس قابلیت ہی کو باقی نہ رکھا تو نعمت کیسے رہتی ؟ —— حضرتِ علامہ اقبال مطالعۂ ذات اور مشاہدۂ کارخانۂ فطرت کے بعد از روئے قرآن تیسرا مصدرِ علم و آگہی تاریخ کو قرار دیتے ہیں اور تاریخ کی عطا کردہ بصیرت یہ قرار دیتے ہیں کہ قومیں اپنی اجتماعی غلط کاریوں کی سزا پاتی ہیں۔[۱]

انفرادی سزا تو ہے ہی، اس سے مفر کیوں، وہ تو واضح حکم ہے کہ ہر ایک کو اللہ کے حضور میں آکے اپنا نامۂ اعمال پڑھنا ہوگا، اس وقت حقائق کھل کر سامنے آجائیں گے۔ اللہ کی طرف سے فہمائش کے طور پر ارشاد ہوگا "آج تو تیری نظر بڑی تیز ہے۔"

لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ
غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ" (سورۃ ۵۰، آیت ۲۲)

(جاری ہے)

❀❀❀❀❀

بقیہ: 'ادراکِ حقائق میں عقل کی واماندگی

کئے ہوئے علوم کو قبول کرنا ہے تو ایسی حالت میں اس کے لئے نہایت ہی مناسب تھا کہ وہ بجائے قوتِ فکریہ وغیرہ اپنے خدام کے سامنے دستِ سوال دراز کرنے اور ان کے عطایا قبول کرنے کے اپنے آقا ربّ العزّت کے روبرو ہاتھ پھیلاتی اور ان کی بخششوں کو لے کر سر آنکھوں پر رکھتی۔"

دورِ حاضر میں مذہبی واردات کا مسئلہ

از قلم : چوہدری مظفر حسین

قرآن حکیم کے مطالعہ میں اگر نقطہ نظر یہ ہو کہ ہمیں ان غیبی اور مابعد الطبیعاتی حقائق کا علم حاصل ہو جائے گا جن پر ایمان لانا ہمارے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے تو اس سلسلے میں خود قرآن حکیم ہمیں متنبہ کر دیتا ہے کہ انسان کو جو علم عطا کیا گیا ہے وہ قلیل ہے۔ پھر جتنا علم اسے عطا کیا گیا ہے وہ یا تو متشابہات کے ضمن میں آتا ہے یا خبر کے زمرے میں آتا ہے اور اس سے انسان کی وہ آرزو پوری نہیں ہوتی جس کی اس کے حواس کو جستجو ہے۔ یہود نے ایمان لانے کے لئے خدا کو عیاناً دیکھنے کی گستاخانہ شرط پیش کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بے قراریٔ محبت سے مجبور ہو کر رب ارنی کی درخواست کی لیکن دونوں صورتوں میں باری تعالیٰ کا جواب نفی میں تھا۔ ذاتِ خداوندی کے بارے میں حسی یا مشاہداتی علم کی نفی کے ساتھ ہی ساتھ قرآن ہمیں یہ کہہ کر خبردار کرتا ہے کہ خدا کے لئے اپنے ذہن سے مثالیں نہ تراشو۔ کیونکہ انسان کے ذہن میں آنے والی کوئی بھی شے اس کی مثل نہیں ہو سکتی۔ معرفتِ الٰہیہ کے ضمن میں قرآن حکیم کا یہ ارشاد ہے کہ اگر سمندر روشنائی بن جائیں اور اتنے ہی سمندر ان میں مزید آ شامل ہوں تو بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں لکھی نہ جا سکیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بزبانِ عجز فرمایا : ما عرفناك حق معرفتك

البتہ جو بات قرآن حکیم میں بڑی وضاحت و صراحت کے ساتھ مذکور ہے اور جسے سمجھنے میں انسان کو قطعاً کوئی دشواری نہیں وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دنیا میں کس قسم کے انسان کی تلاش ہے۔ اس لحاظ سے قرآن حکیم کا حقیقی موضوع تلاشِ آدم ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم ہمیں اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں متوجہ کرتا ہے:

لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ

اور اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں :

قدم در جستجوئے آدمے زن ! خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

قرآن حکیم نے اپنے مطالعہ کے سلسلے میں اسی نقطۂ نظر کو اپنانے کے لئے ایک عجیب و غریب تربیتی اسلوب اختیار کیا ہے۔ سورۂ فاتحہ قرآن کی سب سے پہلی سورہ ہے۔ شروع ہی خدا کی حمد و ثنا سے ہوتی ہے۔ گویا خدا پر ایمان ایک پہلے سے ہی تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ بعد میں عبادت و استعانت کے تمام رشتے اسی سے وابستہ کرتے ہوئے دعا کی شکل میں یہ بات انسان کے ذہن نشین کرا دی ہے کہ وہ جب بھی قرآن حکیم سے رجوع کرے طلبگارِ ہدایت کے نقطۂ نظر سے کرے اور اس کے متصلاً بعد اگلی سورہ میں قرآن مجید قاری کو یقین دلاتا ہے کہ ہاں یہی وہ کتاب ہے جو بلاشک و شبہ متقی لوگوں کے لئے ہدایت ہے۔ لفظ ہدایت کے مفہوم میں منزل، راہِ منزل اور تدبیرِ منزل تینوں شامل ہیں۔ پھر ایک دوسرے مقام پر قرآن حکیم انسان کی منزل کا تعین ان الفاظ میں کرتا ہے کہ وہ اپنے رب کے پاس اس حال میں پہنچے کہ وہ خدا سے راضی ہو اور خدا اس سے راضی!

قرآن حکیم میں خدا اور بندے کے تعلق کو بیان کرنے کے ضمن میں "قُرب" اور "بُعد" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔ عربی لسانیات کے ایک سکالر محمد افتخار الدین دامق "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ "ہم صرف تیری ہی نزدیکی چاہتے ہیں اور تیرے ہی ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے "عبد" کا ترجمہ "پہنچ"، عابد "پہنچنے والا"، معبود "جس تک پہنچا جائے"، عبادت "پہنچ کی صورت"، معبد "پہنچنے کی جگہ"، عبید "جو پہنچ چکا ہو"، اور عباد "پہنچنے کے عمل" سے کیا ہے۔ میں اس پوزیشن میں نہیں کہ اس ماہر لسانیات کی تحقیق کے بارے میں کچھ عرض کر سکوں۔ لیکن اگر یہ تحقیق صحیح ہے تو خدا اور بندے کے درمیان محبت کا رشتہ ناگزیر ہے اور کم از کم ایک مقام پر تو قرآن حکیم بھی ایمان کو خدا اور بندے کے درمیان رشتۂ محبت سے تعبیر کرتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معرفت خداوندی کے بارے میں اعتراف عجز کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں کہ:۔

"میری دلی آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں قتل کیا جاؤں اور پھر زندہ کیا جاؤں، قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں.....

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسی ہستی جسے دیکھنا تو درکنار جس کی معرفت کا حق ادا ہونا بھی محال ہے، اس کے ساتھ رشتۂ محبت استوار ہو تو کیونکر ہو! یہی وہ سوال ہے جو مذہبی واردات کے مسئلہ کو جنم دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان اگر جوہر محبت سے خالی ہو تو عمل میں اخلاص ممکن نہیں اور دیکھا جائے تو صبر اور شکر محبت ہی کی کیفیات ہیں اور ایمان کی زندگی تو ہے ہی سراسر "خیال و نظر کی مجذوبی" سے عبارت۔ بقول علامہ اقبال:

اک شرع مسلمانی، اک جذبِ مسلمانی !!
ہے جذبِ مسلمانی سر فلک الافلاک
بے جذبِ مسلمانی اے رہرو فرزانہ
نے راہِ عمل پیدا نے شاخِ یقیں نمناک

دورِ حاضر کے مسلمان کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ وہ اپنے ایمان کو کس طرح محبت کی حرارت سے گرما کر ناقابلِ شکست یقین میں تبدیل کرے۔ ایک زمانے میں صوفیاء نے یہ فریضہ اپنے ذمہ لے کر اسلام کی قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ لیکن مرورِ زمانہ سے تصوف پر بھی انحطاط آیا اور جمود طاری ہو گیا، خانقاہیں ویران ہو گئیں اور ان سے پھوٹنے والی محبت کے سوتے خشک ہو گئے۔ علامہ اقبال کا خیال ہے کہ اب تصوف کا اپنی اسی پرانی شکل میں احیاء ممکن نہیں رہا بلکہ وہ اس کے افکار میں نو فلاطونی، عجمی اور ہندی نظریات کی آمیزش کو تعلیمات اسلام کے منافی سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کا تو یہ بھی خیال ہے کہ تصوف کے بعض سلسلے جو اسلامی سمجھے

جاتے ہیں درحقیقت مجوسی یعنی عجمی مذہبی واردات کا ہی چربہ ہیں:

"Indeed there is evidence to show that that certain schools Sufism now known as Islamic have only repeated the Magian type of religious experience."

ان کا کہنا ہے کہ قرون وسطیٰ کے دور کی صوفیانہ تکنیک موجودہ دور میں کارآمد نہیں اس لئے وہ تصوّف میں اصلاح اور اجتہاد کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آج انسان تعلق باللہ کے سلسلے میں جس قسم کی نئی باطنی واردات کا متلاشی ہے۔ اس کے لئے نوفلاطونی تصوّف خواہ یہ اسلامی ہو یا عیسوی، محض بیکار ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں

"The quest after a nameless nothing — be it Christian or Muslim — cannot satisfy the modern mind which with its habits of concrete thinking demands a concrete living experience of God."

(ترجمہ) ــــ تصوّف خواہ مسیحی ہو یا اسلامی، اس کی نوفلاطونی شاخ کو جس بے نام سی 'لاشئے' کی جستجو ہے اس زمانے کے انسانوں کو اس کے اندر کوئی سامان تسکین نہیں ملتا۔ ہمارا جی تو یہ چاہتا ہے کہ اگر خدا ہے تو ہمیں اس کی موجودگی کا سچ مچ حقیقی اور واقعی تجربہ ہو ــــ!

علّامہ اقبال کے خیال میں عہد حاضر کے انسان کو جس قسم کے فکر کی عادت ہو گئی ہے اس کا تعلق اشیاء اور حوادث کی دنیا سے ہے اور یہ وہ عادت ہے جس کی اسلام نے اپنے تہذیبی نشو و نما کے ابتدائی ادوار میں حمایت کی تھی۔ چنانچہ وہ خدا کی موجودگی کا سچ مچ، حقیقی اور واقعی تجربہ (Concrete living experience) حاصل کرنے کے لئے دور حاضر کے انسان کی اسی ذہنی عادت (Concrete habits of thought) سے مدد لینا چاہتے ہیں۔ انہیں

اس بات پر اصرار ہے کہ قرآن مذہبی واردات کے حصول کے لئے یہی راہ پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن بعض حالات کی وجہ سے یہ عمل رک گیا۔ فرماتے ہیں۔

"There is definite evidence in the Quran itself to show that Islam aimed at opening up new channels not only of thought but of religious experience as well. Our Magian inheritance, however, has stifled the life of Islam and never allowed the development of its real spirit and aspirations."

"خود قرآن کے اندر شہادت موجود ہے کہ اسلام نہ محض ذہنی بلکہ مذہبی واردات کے لئے بھی نئی راہ پیدا کرنا چاہتا تھا لیکن ہماری مغانہ یعنی عجمی وراثت نے اسلام کی زندگی کو کچل دیا اور اسکی اصل روح اور مقاصد کو ابھرنے کبھی نہیں دیا۔"

مگر موجودہ دور میں سائنسی اور تجرباتی علوم کے غلبے کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ ہم مذہبی واردات کی اس راہ پر لوٹ آئیں۔ قرآن حکیم مظاہر فطرت کو آیاتِ الٰہی کا نام دے کر انہیں معرفت خداوندی کا سب سے بڑا ذریعہ گردانتا ہے۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

"الآیۃ کے معنی علامت ظاہرہ یعنی واضح علامت کے ہیں۔ دراصل آیۃ ہر اس ظاہر شے کو کہتے ہیں جو دوسری ایسی شے کو لازم ہو جو اس کی طرح ظاہر نہ ہو مگر جب کوئی شخص اس شے کا ادراک کرے، اور گو اس نے اصل شے کا بذاتہٖ ادراک نہ کیا ہو، مگر یقین کر لیا جائے کہ اس نے اصل شے کا بھی ادراک کر لیا۔"

امام راغب نے لفظ آیت کی تشریح میں معرفتِ خداوندی کا نکتہ بیان کر دیا ہے

یعنی خدا کی ذات کا یقین مظاہرِ فطرت میں اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کی کارفرمائی کے ادراک سے حاصل کرنا ہے۔ علامہ اقبال اس نکتے کو شعر کی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں۔

حکیم و عارف و صوفی تمام مستِ ظہور
کسے خبر کہ تجلّی ہے عین مستوری!

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں

ہستی حاضر کند تفسیرِ غیب!! می شود دیباچہ تسخیرِ غیب

سائنس اگر "حاضر" کی تشریح کرتے وقت "غیب" کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے تو خدا رسی کا ایک مؤثر ذریعہ بن جائے۔

خرد دیکھے اگر دل کی نگاہ سے
جہاں روشن ہے نورِ لا الٰہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و ماہ سے

چنانچہ علامہ اقبال مذہبی واردات کے لئے جس نئے منہاج کے متلاشی ہیں وہ سائنس میں تصورِ توحید کی آمیزش سے معرضِ وجود میں آئے گا۔ اسی سے ہمیں کائنات میں خدا کی کارفرمائی کا یقین افروز ایمان حاصل ہوگا اور ہم رفتہ رفتہ اس کی محبت کے لذت گیر بن جائیں گے۔ اس غرض کے لئے ہمارے علماء اور صوفیاء کو سائنسی انکشافات سے گہری واقفیت پیدا کر کے انہیں معرفت الٰہیہ کے وسیلے کے طور پر اپنانا ہوگا اور دوسری طرف ہمارے سائنسدانوں اور سائنس کے اساتذہ کو سائنسی انکشافات کو خدا کی نشانیوں کے طور پر دیکھنا اور سمجھنا ہوگا اور اس طرزِ فکر کو اپنی گفتار و تحریر میں اس حد تک سمونا ہوگا کہ سائنس پر ہر لیکچر اور ہر تحریر اللہ تعالیٰ کی معرفت کے لئے وہی کام دے جو کسی وقت میں صوفیا کے مراقبے اور مکاشفے دیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نچھاور کرے کہ انہوں نے علامہ اقبال کے اس نکتے کو خوب سمجھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے اپنی فکر کا وہ

دریچہ مدت سے بند کر رکھا ہے جہاں جھانک کر خدا کا نظارہ ممکن ہے ۔
جب تک ہم مظاہر قدرت میں خدا کی کارفرمائی کا مشاہدہ کرنے کی عادت نہیں ڈال لیتے ہم معرفت الٰہی سے بے بہرہ رہیں گے۔ جس کا لازمی نتیجہ بے یقینی ہے۔
تمام پیغمبروں کی دعوت کا انداز یہی رہا ہے کہ وہ انسان کو مظاہرِ قدرت پر متوجّہ کر کے خدا کی ذات پر ایمان لانے اور سوزِ یقین پیدا کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ ہمیں بھی قلوبِ انسانی کی تسخیر کے لئے اس پیغمبرانہ تکنیک کو اپنانا پڑے گا۔ انہیں پختہ یقین تھا کہ موجودہ دور میں لادینیت کا سب سے بڑا قلعہ سائنس ہے۔ جب تک ہم اس قلعہ کو فتح کر کے وہاں سے لادینیت کو نکال باہر نہیں کرتے، اسلام ایک عالم گیر تحریک کی حیثیت سے دنیا میں نہیں ابھر سکتا۔ عقیدۂ توحید اسی صورت میں "یقین پر مجبور کرنے والی حقیقت" بن سکتا ہے جب اس کا رشتہ طبیعاتی، حیاتیاتی، اور نفسیاتی علوم کے ساتھ جوڑ دیا جائے تاکہ ان علوم کی تمام دریافتیں خدا کے وجود کی زندہ شہادتیں بن جائیں ۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کے نزدیک اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی محبّت کا شدید داعیہ ودیعت کر رکھا ہے جو ہر آن اپنی تشفّی کے لئے مضطرب اور بیتاب ہے۔ رسول اور انبیاء انسان کی اسی فطرت کو پورا کرنے کے لئے تشریف لائے۔ اور انہوں نے مظاہر فطرت میں انوارِ الٰہی کا مشاہدہ کرنے کو محبّتِ الٰہی کے جذبے کی پرورش کا ذریعہ بنایا۔ آج بھی محبّت الٰہی کے جذبے کو بیدار کرنے کا مؤثر طریقہ یہی ہے کہ انسان کو مظاہرِ فطرت میں خدا کی کارفرمائی کا مشاہدہ کروایا جائے تاکہ وہ اس کی قدرت اور ربوبیت کا صحیح معنوں میں قدر دان بن کر اللہ تعالیٰ سے محبّت کرنے لگے اور یہ ایک ایسے نظام تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہو سکے گا جو سائنس میں عقیدۂ توحید کی آمیزش سے دورِ حاضر میں تصوّف کا ایک نیا دبستان معرض وجود میں لائے تاکہ ان کے خزاں دیدہ گلشن میں محبّت کی آبیاری سے بہار آجائے ۔

آج کل اصلاح معاشرہ کے لئے بہت سوچ بچار کی جا رہی ہے۔ لیکن ہمیں یہ جان لینا چاہیئے کہ خدا ترسی اصلاح معاشرہ کی پہلی شرط ہے جس کے

(باقی صـ۸ پر)

ادراکِ حقائق میں عقل کی واماندگی

مولانا الطاف الرحمٰن نبوی

زیرِ طبع کتاب "سیرۃ الخلیل" کے پہلے باب کا عنوانِ رابع

انسانی سیرت و کردار کے مضمرات کا جائزہ لینے کے بعد یہ سوال قدرتی طور پر اُبھر اُبھر کر آدمی کو پریشان اور بے چین کئے رکھتا ہے کہ ایسی نازک صورتِ حال میں جبکہ انسانیت اپنی بداعمالی کی بدولت معرضِ ہلاکت میں پڑی اور تباہی کے دہانے پر کھڑی ہو عقل کا نور اتنی سی یاوری بھی نہیں کر پاتا کہ بدنصیبی کی اس تیرہ و تار وادی سے بچ نکلنے کی کوئی نہ کوئی سبیل ڈھونڈ نکالے اور کاروانِ وجود کو سلامتی کی راہ دکھادے اور پھر یہ سوال اس وقت اور بھی تیز و تند اور تیکھا بن جاتا ہے جبکہ عقل کی غرض و غایت کا تصور کیا جائے جو گم گشتگان کی راہ نمائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

بلاشبہ عقل انسانی بھلے بُرے کی تمیز کا ایک ایسا معیاری پیمانہ ہے جس کے احکام اٹل اور فیصلے دوٹوک ہوا کرتے ہیں تاہم ہر حال میں ہر قسم کے حقائق پر حاوی ہونا اس کے بس کی بات نہیں، حجۃ الاسلام امام غزالیؒ عقل کو آئینے سے تشبیہ دیتے ہیں جو معقولات کے ادراک میں انہیں شرائط کی محتاج ہے جو مادیات کی تصویر کشی میں آئینے کیلئے ضروری ہیں۔

آپ فرماتے ہیں کہ کسی محسوس و مشاہد چیز کی تصویر کشی کیلئے آئینہ میں پانچ باتوں کا ہونا لازمی ہے۔

(۱) آئینے کا مادہ اصل استعداد سے گزر کر فعلی طور پر اس قدر صاف و شفاف ہو جو انعکاس کے لئے ضروری ہوتا ہے نہیں تو کسی کثیف مادے میں..... آئینہ بننے کی ہزار صلاحیت سہی..... فعلی طور پر کسی چیز کی تصویر حاصل کرنی ممکن نہیں

(۲) صفائی اور چمک دمک کے ساتھ ہر قسم کے داغ دھبے اور زنگ آلودگی سے محفوظ ہو ورنہ مطلوب میں خلل ہوگا۔

(۳) جس چیز کی شکل وصورت لینی ہو آئینہ کے بالکل مقابل اور محاذاۃ میں رکھا ہو

(۴) اس چیز اور آئینے کے درمیان کوئی حائل اور حجاب نہ ہو۔

(۵) اگر آئینے میں کسی ایسی چیز کا دیکھنا مقصود ہو جو پیٹھ پیچھے یا سمت مقابل سے ہٹی ہوئی ہو تو ایسی چیز کی تصویر کشی کے لئے آئینے کی صحیح وضع اور استعمال معلوم ہو اور وہ یہ کہ ایک آئینہ تو اس کے مقابل رکھا جائے اور دوسرا اس پہلے آئینے کے مقابل اپنی بصارت کی زد میں۔ اس طرح سے مطلوبہ چیز کی تصویر اولاً پہلے آئینے میں اور وہاں سے آپ کے بالمقابل آئینے میں منتقل ہو کر آسانی سے دیکھی جاسکے گی

____ بعینہٖ اسی طرح حقائق اشیاء کے ادراک میں عقل کے لئے یہی پانچ شرطیں لابدی اور ناگزیر ہیں۔ چنانچہ ان میں سے کسی ایک کا فقدان بھی اس کو صحیح نتیجے پر پہنچنے سے باز رکھنے میں کافی ہوجاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عقل ابھی ناقص ہو اور انعکاس کی پوری صلاحیت اس میں پیدا نہ ہوئی ہو جیسے شیر خوار بچے کی عقل کہ بدیہیات تک کے علم سے خالی ہوتی ہے یا یہ کہ مسلسل ہوس رانیوں سے اس پر ظلمتوں اور کدورتوں کی تہیں چڑھی ہوئی ہوں۔ جس کی وجہ سے اس کی جِلا اور صفائی باقی نہ رہی ہو یا دوسرے امور میں منہمک ہونے کی وجہ سے مطلوب کی طرف متوجہ نہ ہو یا وہ فاسد عقائد جو تقلید یا حُسنِ ظن کی بدولت پہلے سے اس میں رسوخ پاچکے ہوں انعکاس حقائق کے لئے حجاب بن گئے ہوں یا ہر مطلوب کے مبادیات کو مناسب ترتیب دینی نہ جانتا ہو۔

علاوہ ازیں جیسے کہ پچھلی بحث میں بھی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا جاچکا ہے۔ کہ انسان سلسلۂ کائنات کی وہ درمیانی کڑی ہے جو بیک وقت اس کے دونوں سروں یعنی مادیات و روحانیات کے اوصاف سے متصف ہے اور اس سے جملہ کیفیات اوپر نیچے کے دونوں عالموں میں برابر سرایت کرتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس کا دائرہ اثر اس حد تک وسیع ہے جو اس کے علم و ادراک کی زد سے قطعاً خارج ہے[1]۔ پھر اس

---

[1] بظاہر یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ دائرہ علم دائرہ اثر سے تنگ ہو لیکن یہ تعجب اس وقت بالکل کافور ہوجاتا ہے جبکہ دائرہ اثر کی سابقہ تفصیلات ملحوظِ خاطر ہوں یعنی یہ کہ انسان اپنے ہی اختیار سے کوئی عمل کر بیٹھتا ہے۔ اب اس عمل اور اس کے کرنے کا تو اس (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اس کے قول و عمل سے عالم آخرت کی ایک ایسی زندگی بھی بنتی اور بگڑتی چلی جاتی ہے[1] جو اس کے تصور سے بھی وراء الوراء ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کو پورا پورا علم اور احساس ہوتا ہے لیکن یہی عمل کائنات میں جہاں جہاں تک اور جس جس کیفیت سے اثر انداز ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر بیچارے کو اس کی مطلق خبر نہیں ہوتی قرآنی آیات،

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا	"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فساد
فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ	مت کرو زمین میں تو کہتے ہیں کہ ہم تو
مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ	اصلاح ہی کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو
الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا	بے شک یہی لوگ مفسد ہیں لیکن وہ
يَشْعُرُوْنَ ۝ (سورۃ البقرہ آیات ۱۱-۱۲)	اس کا شعور نہیں رکھتے۔"
تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ	"کچھ بعید نہیں کہ آسمان پھٹ پڑیں
وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ	اور زمین کے ٹکڑے اڑ جائیں اور پہاڑ
هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ	ٹوٹ کر گر پڑیں کہ یہ لوگ خدا تعالیٰ
وَلَدًا ۝ (سورۃ مریم آیات ۹۰-۹۱)	کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں۔"

میں انہی باتوں کی صاف صاف جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ فطری صلاحیت و موہبت یا ریاضات و مجاہدات کے علی حسب المراتب اس سلسلے کی کمیت و کیفیت کو بصیرت کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ مکاشفات سے متعلق ہے جو بن دیکھے طبع آزمائیوں کی جگہ نہیں۔

[1] عالم دنیا اور عالم آخرت کے درمیان اختلاف ضابطہ کا یہ فرق ضرور موجود ہے کہ یہاں انسان کے کسی بھی عمل کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود نہیں ہوتا۔ لیکن وہاں اس کے کسی بھی دنیاوی عمل کا اثر اس کی اپنی ذات سے متجاوز نہیں ہوتا۔ وہاں کا تو یہ حال ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا ۝ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۝ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۝ باقی رہا کسی کا کسی کے اعمال پر مؤاخذہ جیسے باپ کو اولاد کی معاصی پر سزا دی جائے یا کسی کا کسی کے نیک عمل سے منتفع ہونا کہ اس کی خاطر یا سفارش سے عذاب سے بچے یا انعام و اکرام (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

دنیا و آخرت کی بے پناہ وسعتیں اور لطافتیں اس کے غور و فکر کی تنگنائیوں میں کیونکر سما جائیں جبکہ کسی بھی حقیقت پر سوچنے کے لئے مادی آلائشوں سے مجبور ہو کر وہ انہیں ضوابط کو بروئے کار لانے کا خوگر ہے جو فقط محسوسات یا زیادہ سے زیادہ ان معقولات میں کارآمد ہوں جو محسوسات سے قریبی علاقہ رکھتے ہوں :

اس بات کو حضرت مجدد صاحبؒ نے یوں بیان فرمایا ہے :

" ربی عقل تو معقولات میں سے بھی صرف ان امور کا ادراک کر سکتی ہے جو محسوسات سے مناسبت رکھتے ہوں۔ لیکن وہ چیز جو محسوسات سے مناسبت نہیں رکھتی اور مشاہدہ میں آنیوالی اشیاء میں سے جن کا کوئی شبیہ اور مثال نہیں وہ عقل کے ادراک میں نہیں آسکتی اور ان کا بند عقل کی چابی سے نہیں کھل سکتا "

(مکتوبات دفتر اوّل حصّہ اوّل مکتوب ۳۴)

اسباب و مسببات اور عامل و معمول کی صحیح دریافت میں عقل کی واماندگی کا ذکر کرتے ہوئے فلسفۂ تاریخ اور علومِ عمرانیات کے امام علامہ عبدالرحمان بن خلدونؒ کی وہ بات آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے جو انہوں نے اپنے مقدمۂ تاریخ میں یوں بیان فرمائی ہے :

" تم فکر کی اس خام خیالی پر ہرگز اعتقاد نہ کرو کہ وہ کائنات اور اس کے اسباب و عوامل کا احاطہ کر سکتی ہے اور اس کے وجود کی ساری تفصیلات سے آگاہ ہو سکتی ہے۔ اس معاملے میں فکر کی خود رائی کو حماقت پر مبنی سمجھو اور یہ سمجھ لو کہ ہر صاحب ادراک انسان ابتدا میں یہی سمجھتا ہے کہ کہ سارے موجودات اس کے علم و ادراک کے احاطے میں آگئے ہیں۔ کوئی چیز اس سے باہر نہیں رہی۔ لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے "

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کا درجہ حاصل کرے تو ان سب صورتوں میں غور کرنے سے یہی کچھ سامنے آتا ہے کہ یا تو دوسرے کے نیک یا برے عمل میں کسی نہ کسی حیثیت سے اس کا بھی حصّہ ہوتا ہے مثلاً دور یا قریب کا واسطہ بن جانا یا کم از کم کسی قول و عمل سے ہمت افزائی کرنا اور یا پھر احسان بلا عمل فضلِ الٰہی ہے جو کسی معروف سلسلے کے تحت میں نہیں آتا (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس سلسلے میں تھوڑا آگے چل کر ارقام فرماتے ہیں :-

" اور یہ عقل اور اس کے ادراکات کے لئے کوئی عیب کی بات نہیں کیونکہ عقل ایک صحیح ترازو کی طرح ہے لیکن تم کو یہ امید نہیں کرنا چاہیئے کہ اسی ترازو سے امور توحید و آخرت اور صفات الٰہیہ کی حقیقت بھی تول سکو گے کیونکہ یہ امید محال ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص سونا تولنے والا کانٹا دیکھے تو یہ امید وابستہ کرے کہ اسی سے پہاڑ بھی تولے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ بات تو ثابت نہیں ہوئی کہ کانٹا اپنے تول میں سچا نہیں، اسی طرح عقل کے بھی حدود ہیں جہاں اس کو ٹھہرنا پڑتا ہے ان سے آگے وہ نہیں بڑھ سکتی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کو بھی اپنی ادراکات کے دائرے میں داخل کرے۔ بلکہ وہ اس کے پیدا کئے ہوئے بے شمار ذرات میں سے ایک حقیر ذرہ ہے "

امام غزالیؒ اور ابن خلدونؒ کے کلام سے یہ بات واضح ہو گئی کہ عقل کی صحت کارکردگی اور درستیٔ عمل کے لئے اولاً تو شرائط خمسہ کا موجود ہونا ضروری ہے اور ثانیاً موضوع و مطلوب کا اس کے دائرۂ عمل کے اندر ہونا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان مادی تیرہ خاکی میں سکونت پذیر عقول کا ان کی بصیرت کو ماؤف اور بینائی کو چندھیانے والے تمام عوارض سے خالی ہونا نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ علاوہ ازیں انسان کی فلاح کا تعلق کچھ ایسے امور سے بھی ہے جو اس کی چھوٹی سی عقل کی رسائی سے یقیناً ماوراء ہیں[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بلکہ اس کی عادت خاصہ ہے اور اس کے برخلاف تکلیف و تعذیب بلا جرم و گناہ تو اس کا وقوع کہیں منقول نہیں جو تعلیل و توجیہ کا محتاج ہو۔

[1] کائنات میں انسان کا کیا مقام ہے، پچھلے عنوان میں اس پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے اعمال کی سند لئے بازگشت نہ صرف عالم دنیا کے گوشے گوشے میں بلکہ اس عالم آخرت کے دشت و کوہ میں بھی سنائی دیتی ہے جو اس کے لئے یکساں دیکھی اور ان جانی چیز ہے۔ اب جبکہ اس کی فلاح اس سیرت و کردار سے متعلق ہے جو دونوں جہانوں کے تقاضوں کی رعایت سے تشکیل پاتا ہے تو بے چاری عقل نادیدہ (باقی صفحہ آئندہ پر)

اس بحث کو ہم حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے رسالے " العقل والنقل " سے ماخوذ ان شذرات پر ختم کرتے ہیں جو اس موضوع پر " بقامت کہتر بقیمت بہتر " کا مصداق ہیں ——— !

" ہمارے نزدیک سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ انسان ہر بات میں محض اپنے فکر و نظر کی ہی تقلید کرے۔ حالانکہ وہ جانتا ہے کہ اس کی یہ فکر بھی خود اس کی ذات کی طرح حادث اور مخلوق ہے اور ان قویٰ میں سے ایک قوت ہے جو خدا تعالیٰ نے ان کے اندر ودیعت فرمائی ہے "

" عالم میں جو غلطیاں مختلف طرح کی پھیلی ہوئی ہیں عقل کی یہ غلطی ان سب میں عجیب تر ہے اور تماشہ یہ ہے کہ سوائے ان معدود لوگوں کے جن کی بصیرت کی آنکھیں رب تعالیٰ نے روشن کر دی ہیں ہر صاحب فکر اس عام غلط کاری (عقل کی ہمہ بینی کے عقیدے) میں مبتلا ہے۔ ہاں ارباب بصیرت کو معلوم ہے کہ خداوند تعالیٰ نے ہر چیز کی ایک خاص فطرت بنائی اور اس خاص فطرت کے اعتبار سے اس شئی کے عمل و حرکت کی حد بندی کر دی ہے۔ مثلاً قوتِ سامعہ کی فطرت مسموعات کے ادراک سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اسی طرح قوتِ باصرہ کا دائرہ عمل مبصرات تک محدود ہے۔ چنانچہ سمجھنا چاہئے کہ عقل کے بھی اپنے حدود ہیں جس سے وہ ایک گام بھی آگے نہیں بڑھ سکتی "

" اللہ اکبر ! یہ عقل خدا تعالیٰ کے مرتبے سے کس قدر جاہل ہے کہ اس نے اپنے فکر ناقص کی تقلید میں خدا تعالیٰ پر جرح کرنے کو آسان سمجھا۔ حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ عقل کے پاس بجائے خود کسی طرح کا اور کسی شے کا علم موجود نہیں ہے۔ اس کا کام محض حواس خمسہ ظاہرہ اور قوت خیالیہ اور قوتِ مصوّرہ وعلیٰ ہذا القیاس دوسری قوتوں کے عطا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) و نادانستہ امور کے تقاضے کیا سمجھے اور ان کی رعایت کیوں برتے۔

(باقی صـ ۱۶ پر)

مروّجہ نظامِ زمینداری اور اسلام

از قلم، مولانا محمّد طاسین

(دوسری قسط)

اب میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی کچھ احادیث نقل کرتا ہوں جن سے صریح اور قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت جائز اور صحیح چیز ہے لیجئے ملاحظہ فرمائیے :-

عن جابرؓ بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم من احیا ارضا میتۃ فھی لہ (الترمذی)

"حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا یعنی غیر آباد کو آباد کیا اور قابلِ کاشت بنایا وہ اسی کی ہو گئی۔"

عن عائشۃ رضی اللہ عنہا ان النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم قال من عمّر ارضاً لیست لاحد فھو احق بھا۔ (صحیح البخاری)

"حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جس نے آباد کیا ایسی زمین کو جو کسی کی نہیں تھی پس وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔"

عن عروۃؓ قال اشھد ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قضی ان الارض ارض اللہ والعباد عباد اللہ ومن احیٰی مواتا فھو احق بھا (سنن ابی داؤد)

"حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ زمین اللہ کی زمین ہے اور بندے اللہ کے بندے ہیں جس نے

بنجر وغیر آباد زمین کو آباد کیا اور قابلِ کاشت بنایا پس وہ اس کا زیادہ حق دار ہے"

ان احادیث میں " فھو احق بھا " کے جو الفاظ ہیں وہ اس پر دلالت کرتے ہیں کہ جو شخص کسی بیکار و بنجر زمین کو زراعت کے لئے آباد کرتا ہے اسے اس زمین سے انتفاع کے حق میں دوسروں پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے اسی کا دوسرا نام ملکیت ہے اور اس کا سبب ظاہر ہے کہ وہ مفید اثرات ہوتے ہیں جو اس شخص کی سعی و محنت سے وجود میں آکر اس خطۂ زمین کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔

مزارعت و مخابرت کے جواز و عدم جواز سے متعلق جو کثیر التعداد احادیث ہیں ان سے بھی ملکیت زمین کا ثبوت و جواز فراہم ہوتا ہے ان میں سے چند یہ ہیں :

عن جابر بن عبد اللہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من کانت لہ ارض فلیزرعھا فان لم یستطع ان یزرعھا وعجز عنھا فلیمنحھا اخاہ المسلم ولا یؤاجرھا ایاہ : (صحیح المسلم)	"حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کے لئے زمین ہو وہ اسے خود کاشت کرے اگر خود کاشت نہ کر سکے اور اس سے عاجز ہو تو پھر اپنے کسی مسلمان بھائی کو مفت فائدہ اٹھانے کے لئے دے دے اور اس زمین کو اجارے پر نہ دے۔"

اس حدیث میں دو لفظ ایسے ہیں جو ملکیت زمین کے ثبوت و جواز پر دلالت کرتے ہیں: پہلا لفظ لَہٗ اَرْضٌ اور دوسرا لفظ فَلْیَمْنَحْھَا ہے ، لَہٗ میں لام تملیک کے لئے ہے لہٰذا معنی ہوئے جس کی ملکیت میں کوئی زمین ہو اور چونکہ منحہ کے معنی ہیں اپنی مملوکہ چیز کسی کو بطور احسان مفت استعمال کے لئے عطا کرنا۔ لہٰذا اس سے بھی ملکیت زمین کا جواز نکلتا ہے۔

اس طرح کی دوسری احادیث میں رَبُّ الْاَرْضِ ، صاحب الارض اور اھل الارض کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہ بھی زمین کی شخصی ملکیت کے جواز پر دلالت

کرتے ہیں اور بعض احادیث میں صراحتہً ملکیت کے الفاظ بھی ہیں۔ جیسے یہ حدیث:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے
وسلم نھانا ان یزرع احدنا	منع فرمایا ہمیں یہ کہ ہم سے کوئی کاشت
الا ارضا یملك رقبتھا او	کرے مگر اس زمین کو جس کا وہ
منحة یمنحھا رجل	مالک ہے یا اسے کسی نے وہ زمین
	منحہ کے طور پر دی ہے"

علاوہ ازیں وہ احادیث و آثار بھی ملکیت زمین کے جواز پر صاد کرتی ہیں جن میں زمین کی خرید و فروخت اور اس کے وقف و ہبہ وغیرہ کا بیان ہے۔ مثلاً سنن ابن ماجہ میں ہے:

عن ابن عباس عن النبی صلی	"حضرت عبداللہ بن عباس سے
اللہ علیہ وسلم قال من	روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم
کانت لہٗ اَرضٌ فاراد بیعھا	نے فرمایا جس کی ملکیت میں زمین
فلیعرضھا علی جارہ	ہو اور وہ اسے بیچنا چاہے تو سب سے
ص ۱۸۲	پہلے اپنے پڑوسی پر پیش کرے"

ابن ابی شیبہ میں یحییٰ بن سعید کی روایت ہے:

ان عمر رضی اللہ عنہ اجلی	"حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
اھل نجران والیھود والنصاریٰ	نے اہل نجران اور یہود و
واشتریٰ بیاض ارضھم	نصاریٰ کو جلاوطن کیا اور ان کی
وکروعھم	زمینوں اور باغوں کو اُن
	سے خریدا"

اسی طرح کتاب الخراج لیحییٰ بن آدم میں صفحہ پچاسی پر روایت ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے پانچ صحابہ کرام کو بطور جاگیر اراضی دیں اور حضرت اسامہ بن زید نے اپنی زمین فروخت کر دی۔

قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج میں کچھ اور بھی ایسے آثار ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے غیر مسلم ذمیوں سے خراجی زمینیں

خریدیں اور چونکہ خرید و فروخت ایسی ہی چیز کی ہوا کرتی ہے جو بائع و مشتری کی ملکیت میں ہو۔ لہٰذا ایسی روایات سے زمین کی شخصی ملکیت ثابت ہوتی ہے

اسی طرح کتب احادیث میں متعدد ایسی روایات بھی ملتی ہیں جن میں یہ بیان ہے کہ بعض صحابہ کرام جیسے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنے باغات مع زمینوں کے راہِ خدا میں صدقہ اور وقف کئے۔ ان روایات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت جائز ہے کیونکہ وقف و صدقہ وہی چیز ہوا کرتی ہے جو کسی شخص کی ملکیت میں ہو۔

نیز ان احادیث سے بھی زمین کی شخصی ملکیت کا ثبوت و جواز فراہم ہوتا ہے جن میں دوسرے کی زمین غصب کرنے کی ممانعت اور اس پر شدید عذاب کی وعید ہے۔ مثال کے طور پر صحیح المسلم کی یہ حدیث ملاحظہ فرمائیے:

عن سعید بن زید قال	"حضرت سعید بن زید نے روایت
قال رسول اللہ صلی اللہ	کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
علیہ وسلم من اخذ شبرا	نے فرمایا جس نے دوسرے کی
من الارض ظلما فانہ یطوقہ	بالشت بھر زمین بھی ناحق طور پر لی
یوم القیامۃ من سبع ارضین۔	قیامت کے دن اس زمین کے

ساتوں طبقے اس کے گلے میں طوق کی طرح پڑے ہوں گے۔"

خلاصہ یہ کہ قرآن و حدیث میں بکثرت ایسی نصوص ہیں جو زمین کی شخصی و انفرادی ملکیت کے جواز پر واضح الدلالۃ ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ فقہاء اسلام کے درمیان اس مسئلہ میں کبھی اختلاف نہیں ہوا بلکہ تمام مکاتب فقہ کا اس پر مکمل اتفاق رہا ہے

اراضی کی چھ قسمیں کتب فقہ میں ملکیت زمین کے مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی اور زمین کی مختلف قسموں کے متعلق احکام بیان کئے گئے ہیں۔ بعض کتابوں میں اراضی کی چھ قسمیں اور ان کی تفصیل اس طرح ہے: اراضی مملوکہ، اراضی موقوفہ، اراضی مملکت، اراضی موات،

اراضی الحوز اور اراضی متروکہ۔

اراضی مملوکہ وہ اراضی ہیں جو اسباب ملکیت میں سے کسی سبب کی بنا پر کسی فرد یا جماعت کی ملکیت قرار پائی ہوں۔ غیر آباد سے آباد کرنے کی بنا پر یا کسی ایسے طریقۂ انتقال کی بنا پر جس میں پہلے مالک کی حقیقی رضامندی موجود ہوا کرتی ہے۔ ایسی اراضی کا حکم یہ ہے کہ ان کا مالک ان میں ہر وہ تصرف کر سکتا ہے جو اس کے لئے فائدہ مند ہونے کے ساتھ دوسروں کے لئے ضرر رساں نہ ہو۔ لیکن دوسرا کوئی اس کی رضامندانہ اجازت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا ورنہ گنہگار و مجرم قرار پاتا ہے

اراضی موقوفہ وہ اراضی ہیں جن کو ان کے مالکوں نے مصارف خیر اور رفاہ عام کے لئے وقف کر دیا ہو۔ ایسی اراضی کا حکم یہ ہے کہ وہ کسی کی ملکیت نہیں ہوتیں اور کوئی ان کو بیچ اور خرید نہیں سکتا اور نہ ہبہ کر سکتا ہے، واقف خود یا اس کا قائم مقام اپنی تحویل و نگرانی میں رکھ کر ان کے فوائد و ثمرات صرف ان مصارف میں خرچ کر سکتا ہے جن کے لئے وہ اراضی وقف کی گئیں۔

اراضی مملکت کے ذیل میں وہ اراضی آتی ہیں جو حکومت کی تحویل و نگرانی میں اور بیت المال سے متعلق ہوتی ہیں ان میں دو طرح کی اراضی شامل ہیں: ایک وہ جن کے مالک کسی ارضی و سماوی آفت کی زد میں آ کر مرکھپ گئے ہوں یا ناقابل برداشت حالات کی وجہ سے ترک وطن پر مجبور ہو گئے اور کسی دوسرے ملک میں چلے گئے ہوں اور پیچھے ان کا کوئی والی وارث موجود نہ ہو اور دوسری وہ اراضی جو دشمن سے جنگ کے بعد مال غنیمت کے طور پر ملی اور فاتحین میں تقسیم کے بعد حکومت کے پاس بچ گئی ہوں۔ ایسی اراضی کا شرعی حکم یہ ہے کہ ان میں تصرف کرنے کا تمام تر اختیار حکومت اور اس کے سربراہ کو ہوتا ہے۔ وہ ان میں ہر وہ تصرف کر سکتا ہے جو اس کی صوابدید کے مطابق ملک کے اجتماعی مفاد کے لئے ضروری ہو۔ اگر وہ یہ دیکھے کہ اجتماعی مفاد کے لئے ان کو کاشت کرانا ضروری ہے تو بیت المال کے خرچ سے ان کو کاشت بھی کرا سکتا ہے، نیز وہ ایسی اراضی ان لوگوں کو بطور جاگیر بھی دے سکتا ہے جنہوں نے ملک و قوم کے لئے غیر معمولی

خدمات انجام دی ہوں اور کوئی بڑا فائدہ پہنچانے کی وجہ سے ملک و قوم پر ان کا احسان ہو اور اگر ضروری ہو تو وہ ایسی اراضی کو فروخت کر کے ان کی رقم بیت المال میں بھی داخل کر سکتا ہے۔

اراضی موات اراضی کی چوتھی قسم اراضی موات ہے اور ان سے مراد وہ غیر آباد اراضی ہیں جن سے کسی کا حق آبادکاری بھی متعلق نہ ہو اور وہ آبادی یعنی شہر و گاؤں سے اتنی دور بھی ہوں کہ یہاں کی اونچی سے اونچی آواز وہاں سنائی نہ دیتی ہو، اس قسم کی اراضی کا شرعی حکم یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے ان کو آباد کرے اور قابلِ کاشت بنائے وہ ان کا مالک قرار پاتا ہے۔ بعض ائمہ فقہاء کے نزدیک اس میں سلطان و امیر ریاست کی اجازت ضروری ہے اور بعض کے نزدیک ضروری نہیں۔ جن کے نزدیک ضروری ہے وہ بھی سلطان و امیر کی اجازت کو سبب ملکیت نہیں مانتے بلکہ دوسروں کی طرح وہ بھی سبب ملکیت، احیاء و تعمیر کو مانتے ہیں۔ البتہ سلطان کی اجازت سے حق آبادکاری ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔ جس کی مدت زیادہ سے زیادہ تین سال ہے۔ اگر وہ اس عرصے میں اسے آباد نہیں کرتا تو اس کا حق آبادکاری ختم ہو جاتا ہے اور وہ زمین اپنی سابقہ حالت کی طرف لوٹ جاتی اور اس کی حیثیت اَرضِ مَیتہ کی ہو جاتی ہے، علامہ کاسانی بدائع الصنائع میں لکھتے ہیں:

لو اقطع الامام الموات انسانا فترکه ولم یعمره لا یتعرض له الی ثلاث سنین فاذا مضی ثلاث سنین فقد عاد مواتا کما کان لقوله علیه السلام لیس لمحتجر بعد ثلاث سنین حق

ص ۱۹۴ - ج ۶

"اگر امام و امیر نے کسی انسان کو بطور جاگیر مردہ زمین دی پس اس نے اسے یونہی چھوڑ دیا اور آباد نہ کیا تو تین سال تک اس سے کچھ تعرض نہ کیا جائے۔ البتہ جب تین سال گزر جائیں تو وہ زمین پھر ویسی ہی مردہ زمین کے حکم میں لوٹ جاتی ہے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین سال کے بعد محتجر کا کوئی حق نہیں۔

تحجیر واحتجار اور اس کا حکم

اس حدیث میں جس محتجر کا ذکر ہے اس کے معنیٰ ہیں احتجار وتحجیر کرنے والا، اور احتجار وتحجیر کا مطلب ہے کسی بنجر وغیر آباد زمین کے چاروں طرف پتھر وغیرہ گاڑ کر نشان بندی کرنا اور یہ بتلانا کہ یہ قطعہ زمین میرے آباد کرنے کے لئے ہے۔ دوسرا کوئی اسے آباد کرنے کی کوشش نہ کرے، مطلب یہ کہ اس تحجیر واحتجار سے کوئی شخص اگرچہ غیر آباد زمین کا مالک نہیں بنتا۔ لیکن اس سے اتنا ضرور فائدہ ہوتا ہے کہ تین سال تک اسے حق آبادکاری حاصل ہو جاتا ہے۔ تین سال کے اندر دوسرا کوئی اسے آباد نہیں کرسکتا۔ البتہ تین سال گزرنے پر اس کا حق آبادکاری ختم ہو جاتا ہے۔ اب دوسرا جو اسے آباد کرے وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ اس بارے میں بھی کتاب بدائع الصنائع کی عبارت حسب ذیل ہے۔

ولو حجر الارض الموات لا یملکها بالاجماع لان الموات یملك بالاحیاء، لانه عبارة عن وضع احجار او خط حوله یرید ان یحجر غیره عن الاستیلاء علیها وشیئ من ذلك لیس باحیاء فلا یملکها:

(ص ۱۹۵ ج ۶)

"اگر کسی نے مردہ وغیر آباد زمین کی تحجیر کی تو اس پر اجماع ہے کہ وہ محض تحجیر سے اس کا مالک نہیں بنتا۔ مالک بننے کے لئے اسے زندہ وآباد کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ تحجیر کا مطلب ہے زمین کے اردگرد پتھر رکھنا اور نشانات لگانا تاکہ دوسرے کو اس پر قبضہ کرنے سے روکا جائے اور تحجیر چونکہ احیاء نہیں اس کے ذریعے کوئی زمین کا مالک نہیں بنتا۔"

احیاء الارض کی مختلف شکلیں

"احیاء" یعنی مردہ زمین کو زندہ اور غیر آباد کو آباد کرنے کی مختلف شکلیں ہیں جن کی وجہ سے کوئی شخص کسی خطۂ زمین کا مالک قرار پاتا ہے، مثلاً ایک زمین زیر آب اور پانی میں ڈوبی ہوئی ہے تو اس کے اوپر سے پانی ہٹانا اور خشک کرکے قابل کاشت بنانا، اس کا احیاء ہے، کسی زمین میں گڑھے اور نشیب وفراز ہیں تو ان کو بھر کر ہموار کرنا، اس کا احیاء ہے۔ یا وہ زمین ایسی ہے جس میں جھاڑ جھنکاڑ وغیرہ ہیں

تو اس کو ان سے صاف کرنا اور کھود کر نکالنا اس کا احیاء ہے۔ اسی طرح اگر وہاں پانی نہیں تو دریا، چشمے اور کنوئیں سے وہاں تک پہنچانا اور سینچنے کا انتظام کرنا بھی احیاء ہے۔ پتھریلی زمین سے پتھر دور کر کے اس میں مٹی ڈالنا اور سیرابی کے لئے نالیاں بنانا بھی احیاء کی ایک شکل ہے۔ فقہاء کرام نے اپنی کتابوں میں زمین کے احیاء کی متعدد شکلیں لکھی ہیں جن میں ہر شکل ایسی ہے جس میں کاشت کار کو اچھی خاصی محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے جس سے اس قطعہ زمین میں ایک نئی افادیت رونما ہوتی ہے جو ملکیت کی اصل بنیاد ہے۔

تحجیر کے متعلق بعض فقہاء کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص ایک کی تحجیر شدہ غیر آباد زمین کو بلا اجازت آباد کر لیتا ہے تو گو کراہیت کے ساتھ سہی لیکن احیاء کی وجہ سے اس کا مالک بن جاتا ہے۔ لہٰذا حکومت ایسے شخص کو تعزیراً کچھ سزا تو دے سکتی ہے لیکن حق ملکیت سے محروم نہیں کر سکتی۔ اسی طرح بعض فقہاء نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص اجرت پر دوسرے کے لئے مُردہ زمین زندہ اور بنجر زمین قابلِ کاشت بناتا ہے تو چونکہ احیاء اس اجیر سے ظہور میں آتا ہے جو ملکیت کا اصل سبب ہے لہٰذا مستاجر کی بجائے وہ اجیر اس کا مالک قرار پاتا ہے۔ مستاجر اس سے اجرت واپس لے سکتا ہے زمین نہیں لے سکتا۔ البتہ آباد کرنیوالا اجیر خود اپنی مرضی خوشی سے اس کو بالمعاوضہ یا بلا معاوضہ دے سکتا ہے اور اپنی ملکیت اس کی طرف منتقل کر سکتا ہے۔

محض تحجیر سے کوئی شخص کسی مردہ و غیر آباد زمین کا مالک نہیں بنتا۔ اس کا اظہار ایک تو اس حدیث نبوی سے ہوتا ہے جو کتاب الخراج میں قاضی ابو یوسفؒ نے بایں طور پر بیان فرمائی ہے:۔

حدثنی لیث عن طاؤس قال	"حضرت طاؤس سے روایت کرتے
قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ	ہوئے مجھے لیث نے بتلایا کہ رسول اللہ
وسلم عادی الارض للہ و	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اجاڑ پڑی
للرسول ثم لکم من بعد	ہوئی زمین اللہ کے لئے اور رسولؐ
فمن احیا ارضاً میتۃ فھی	کے لئے ہے پھر اس کے بعد تمہارے
لہ ولیس لمحتجر حق بعد	لئے۔ پس جس نے مردہ زمین کو زندہ

ثلاث سنین ص۶۵ — کیا وہ زمین اس کی ہوگئی اور تحجیر کرنے والے کے لئے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں۔"

اور دوسرے اس کا ثبوت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے اور فرمان سے بھی فراہم ہوتا ہے جو آپ نے اپنے عہد خلافت میں صادر فرمایا جب آپ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا، کتاب الخراج۔ قاضی ابو یوسف اور کتاب الخراج۔ یحییٰ بن آدم میں ہے۔

عن عمرو بن شعیب عن ابیہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اقطع لاناس من مزینۃ اوجھینۃ ارضا فلم یعمروھا فجاء قوم فعمروھا فخاصم الجھنیون اوالمزنیون الی عمر بن الخطابؓ فقال لوکانت منی اومن ابی بکر لرددتھا ولکنھا قطیعۃ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ثم قال من کانت لہ ارض ثم ترکھا ثلاث سنین فلم یعمرھا، فعمرھا قوم آخرون فھم احق بھا۔

(ص۶۱ لابی یوسف، ص۱۰۲ لیحییٰ بن آدم)

"حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے باپ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ مزینہ یا جہینہ کے کچھ لوگوں کو ایک زمین دی تھی جسے وہ کافی عرصہ تک آباد نہ کرسکے بیکار پڑی دیکھ کر کچھ دوسرے لوگوں نے اسے آباد کرلیا اس پر دونوں گروہوں کے درمیان جھگڑا ہوا اور مقدمہ حضرت عمر فاروقؓ کے پاس پہنچا۔ آپ نے حقیقت حال معلوم کرنے کے بعد فرمایا اگر یہ زمین میری یا حضرت ابوبکر کی دی ہوتی تو لوٹا دیتا لیکن رسول اللہ صلعم نے عطا فرمائی تھی جس پر تین سال سے زیادہ گزر گئے اور پھر یہ قانون بیان فرمایا کہ جس کی زمین ہو اور وہ اسے تین سال معطل چھوڑ دے آباد نہ کرے تو پھر دوسرے جو اسے آباد کریں وہ ان کی ہوجاتی ہے"

اس روایت میں یہ جو الفاظ ہیں کہ اگر میری یا حضرت ابوبکرؓ کی دی ہوئی زمین ہوتی تو میں لوٹا دیتا، ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کے سامنے یہ کیس

پیش ہوا اس وقت تک حضرت ابوبکرؓ اور آپ کی خلافت پر تین سال بھی نہ گزرے تھے حضرت ابوبکرؓ کا عہد خلافت تو کل سوا دو سال تھا اور اب غالباً حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کا پہلا یا دوسرا سال تھا، البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر تین سال سے زیادہ گزر گئے تھے۔ لہٰذا جو زمین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ مزینہ یا جہینہ کو آباد کرنے کے لئے مرحمت فرمائی تھی اس پر اس وقت جب اس کا مقدمہ عدالت فاروقی میں پیش ہوا یقیناً تین سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ لہٰذا آپ نے فرمایا لیکن یہ زمین چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عطاکردہ ہے لہٰذا اسلامی قانون کے مطابق یہ لوٹائی نہیں جا سکتی اور جنہوں نے اسے آباد کیا ہے وہی اس کے مالک ہیں۔

اسی طرح بعض روائتوں کے مطابق حضرت عمر فاروقؓ کے علم میں کچھ اور بھی ایسے واقعات آئے کہ لوگوں نے تحجیر کے ذریعے زمینیں روک رکھی ہیں۔ نہ خود آباد کرتے ہیں اور نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں تو آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر یہ اعلان فرمایا کہ غیر آباد زمین اس کی ہے جو اسے آباد کرے اور محتجر کے لئے تین سال کے بعد کوئی حق نہیں، مثلاً مذکورہ دونوں کتابوں میں ہے :

عن سالم بن عبد اللہ عن ابیہ ان عمر بن الخطاب قال علی المنبر من احیٰی ارضاً میتۃ فھی لہ ولیس لمحتجر حق بعد ثلاث سنین وذٰلک ان رجالا یحتجرون من الارض مالا یعملون۔ (ص۶۵، ابویوسف، ص۱۰۰ یحییٰ بن آدم)	"حضرت سالمؒ نے اپنے باپ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کیا کہ حضرت عمرؓ نے منبر پر مجمع عام کے سامنے اعلان فرمایا: جس شخص نے مردہ زمین کو زندہ کیا وہ اس کی ہے اور یہ کہ محتجر کا ایسی زمین کے ساتھ تین سال کے بعد کوئی حق نہیں رہتا اور یہ آپ نے اس وقت اعلان فرمایا جب آپ کے علم میں یہ بات آئی کہ کچھ لوگوں نے زمینیں روک رکھی ہیں اور آباد نہیں کر رہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے بحیثیت امیر المؤمنین منبر پر کھڑے ہو کر یہ اعلان فرمایا۔ لہٰذا مذکورہ روایات کے علاوہ کتاب الخراج وغیرہ میں اور بھی

متعدد روایات ہیں جن میں اس کا بیان ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ خلیفہ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس قانونی اعلان کی زد میں جو لوگ آئے ان میں ایک حضرت بلالؓ بن الحارث المزنی بھی تھے، ان کی درخواست پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک طویل و عریض زمین عطا فرمائی تھی جس کا کچھ حصہ وہ آباد کر سکے اور کچھ اب تک آباد نہ کر سکے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بلوا کر فرمایا جو زمین آپ اب تک آباد نہیں کر سکے دے دو کہ ہم دوسرے مسلمانوں میں تقسیم کر دیں، انہوں نے دینے سے انکار کیا اور فرمایا کہ جو زمین مجھے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی ہے وہ کوئی مجھ سے کیسے لے سکتا ہے۔ اس پر حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک عادت تھی کہ آپ سے کوئی جو بھی مانگتا آپ دے دیتے اور کبھی انکار نہ فرماتے آپ نے وہ زمین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگی تھی لہٰذا آپ نے عطا فرمادی مقصد یہ تھا کہ آپ اسے آباد اور کاشت کریں، لہٰذا آپ کی خدمت میں یہ گذارش ہے کہ جتنی زمین کا آباد کرنا آپ کی طاقت میں ہے اور آپ اسے آباد کر سکتے ہیں وہ اپنے پاس رکھئے اور باقی واپس کر دیجئے کہ دوسرے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے، اس پر بھی جب وہ تیار نہ ہوئے تو ان سے زائد زمین زبردستی لے کر دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دی گئی۔

یہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس عربی عبارت کا رواں ترجمہ ہے جو کتاب الخراج، یحییٰ بن آدم میں صفحہ ایک سو دس پر، کتاب الاموال ابو عبید میں صفحہ ایک سو نوے پر اور السنن الکبریٰ بیہقی میں صفحہ ایک سو پچاس جلد چھ پر ہے۔ وہ عبارت بغیر ترجمہ کے اس طرح ہے۔

عن عبد الله بن ابی بکر قال جاء بلالؓ بن الحارث المزنی الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فاستقطعه ارضا فقطعها له طویلة عریضة فلما ولی عمر قال له یا بلال انك استقطعت رسول الله ارضا طویلة عریضة فقطعها لك وان رسول الله صلی الله علیه وسلم لم یکن لیمنع شیئا یسأله، وانك لا تطیق ما فی یدیك فقال اجل قال

فانظرها قويت عليه منها فامسكه وما لم تطق فادفعه الينا نقسمه بين المسلمين، فقال لا افعل والله شيئي اقطعنيه رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال عمر والله لتفعلن، فاخذ منه ما عجز عن عمارته فقسمه بين المسلمين۔

اس روایت سے ضمناً یہ نتیجہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کے درمیان مزارعت کا رواج ختم ہو چکا تھا ورنہ حضرت بلال المزنی زائد زمین مزارعت پر دے سکتے تھے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی فرما سکتے تھے کہ زائد زمین مزارعت پر دے دو۔ اس طرح زمین آباد بھی ہو جاتی اور ان کی ملکیت میں بھی رہتی اور وہ بدمزگی پیدا نہ ہوتی جو ان سے زبردستی زائد زمین لینے سے پیدا ہوئی کیونکہ وہ دینے پر آمادہ نہ تھے۔

اراضی الحوز اراضی کی پانچویں قسم اراضی الحوز ہے۔ فقہا کے لکھنے کے مطابق اس قسم میں وہ خراجی اراضی داخل ہیں جن کے مالک کسی وجہ سے ان کو کاشت کرنے اور حکومت کا خراج ادا کرنے سے قاصر و عاجز ہو گئے ہوں اور انہوں نے عارضی طور پر وہ اراضی حکومت کے حوالے کر دی ہوں کہ تاوقتیکہ وہ ان کو کاشت کرنے کے قابل نہ ہو جائیں حکومت جس طرح چاہے ان سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ اس قسم کی اراضی کا حکم یہ ہے کہ وہ اصل مالکوں کی ملکیت میں رہتی ہیں چنانچہ وہ ان کو فروخت اور وقف و ہبہ وغیرہ کر سکتے ہیں۔ حکومت ایسی زمینوں کی مالک نہیں ہوتی بلکہ صرف نگراں و محافظ ہوتی ہے۔ ان کے مالک جب ان کو دوبارہ آباد کرنے یعنی کاشت کرنے پر قادر ہو جائیں تو ان کو واپس کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

اراضی متروکہ اراضی کی چھٹی قسم کا نام اراضی متروکہ ہے ان سے مراد وہ اراضی ہیں جو آبادی یعنی شہر یا گاؤں کے اندر یا متصل قرب و جوار میں واقع ہوتی اور غیر زرعی مقاصد اور مصالح کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں جیسے تفریح گاہیں، کھیل کود کے میدان، چراگاہیں، قبرستان وغیرہ جو پوری آبادی کے فائدہ کے لئے مخصوص ہوتی اور ان کی حیثیت اجتماعی ملکیت کی ہوتی ہے۔ ایسی اراضی کا حکم یہ ہے کہ وہ جس مقصد کے لئے ہوتی ہیں۔ اس سے آبادی کا ہر

فرد فائدہ اٹھا سکتا ہے اور کسی کو اس سے روکا اور منع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ایسی اراضی سے فائدہ اٹھانے کا حق آبادی کے سب لوگوں کو یکساں طور پر ہوتا ہے اور یہ کہ ایسی اراضی جن اجتماعی مقاصد کے لئے مخصوص و متعین ہوتی ہیں انہی مقاصد کیلئے ان کو استعمال کیا جا سکتا ہے اور اگر کسی دوسرے مقصد کے لئے استعمال کرنا ہو تو صرف اجتماعی مشورے و مرضی سے استعمال کیا جا سکتا ہے انفرادی رائے اور مرضی سے نہیں۔

بہر حال فقہاءِ اسلام نے زمینوں کی یہ جو چھ قسمیں بیان کی ہیں ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بعض زمینوں کا تعلق شخصی و انفرادی ملکیت سے اور بعض کا اجتماعی و قومی ملکیت سے ہے دو قسموں یعنی اراضی مملکت اور اراضی متروکہ کا تعلق اجتماعی ملکیت سے اور باقی چار قسموں کا تعلق انفرادی ملکیت سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فقہ اسلامی میں زمین کی اجتماعی ملکیت کا تصور موجود ہے اور اس کی بنیاد اجتماعی مفاد اور اس کے تحفظ پر ہے، مطلب یہ کہ جو زمینیں اجتماعی مفاد و مصلحت کے لئے مخصوص و متعین ہوں اور اس اجتماعی مفاد و مصلحت کا تحفظ اجتماعی ملکیت ہی کے ذریعے ہو سکتا ہو تو شریعت اسلامی کی رو سے ایسی زمینوں کی اجتماعی ملکیت جائز بلکہ ضروری قرار پاتی ہے۔

زمین کی انفرادی اور اجتماعی ملکیت

دراصل شریعت کے تمام احکام و ضوابط اور جملہ قوانین و قواعد میں خود انسانوں کی مصلحت و منفعت کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ جن امور و معاملات کو اختیار کرنے سے مطلوبہ مصلحت و منفعت کا تحفظ ہو سکتا اور وہ بروئے کار آ سکتی تھی شریعت نے ان کو جائز ٹھہرا کر اختیار کرنے کا حکم دیا ہے اور جن کو اختیار کرنے سے مطلوبہ مصلحت و منفعت کا ضیاع ہو سکتا اور اس کا حصول ناممکن ہو جاتا تھا شریعت نے ان کو ناجائز قرار دے کر ان سے روکا اور منع فرمایا ہے۔ لہٰذا جہاں انسانوں کی عمومی مصلحت کا تحفظ زمین کی انفرادی ملکیت سے ہوتا تھا وہاں شریعت اسلامی نے انفرادی ملکیت کو جائز ٹھہرایا اور جہاں اس مصلحت کا تحفظ زمین کی اجتماعی ملکیت سے ہو سکتا تھا وہاں شریعت نے

اجتماعی ملکیت کو جائز اور ضروری قرار دیا ہے۔ غرضیکہ اصل اور بالذات مقصود نہ انفرادی ملکیت ہے اور نہ اجتماعی ملکیت بلکہ اصل مقصود انسانوں کی مصلحت و منفعت ہے اور یہ دونوں اس کا ذریعہ و وسیلہ ہیں لہٰذا ہر حال میں صرف ایک کو اسلامی اور دوسری کو غیر اسلامی سمجھنا غلط اور اسلام کی غیر حقیقی تعبیر و ترجمانی ہے کیونکہ اسلام نہ ہر حال میں ہر چیز میں انفرادی ملکیت کا قائل ہے اور نہ ہر حال اور ہر چیز میں اجتماعی ملکیت کا قائل، بلکہ بعض حالات اور بعض چیزوں میں انفرادی ملکیت کو صحیح و جائز اور دوسرے بعض حالات اور بعض اشیاء میں اجتماعی ملکیت کو جائز و درست کہتا ہے کیونکہ ملکیت جس مصلحت پر مبنی ہے وہ مصلحت کبھی اور کہیں انفرادی ملکیت اور کبھی اور کہیں اجتماعی ملکیت سے حاصل ہوتی اور بروئے کار آتی ہے۔

اس تحریر سے مقصد یہ کہ اسلام کے معاشی نظام میں زمین وغیرہ کی انفرادی ملکیت کے ساتھ اجتماعی ملکیت کا تصور بھی ایک حد تک موجود ہے گو اس کا دائرہ اتنا وسیع نہیں جتنا کہ اشتراکیت کے معاشی نظام میں ہے لہٰذا زمین کی اجتماعی ملکیت کے تصور کو کلیتہً اور علی الاطلاق اشتراکی تصور کہنا اور اسلام سے اس کی نفی کرنا کسی طرح درست نہیں۔

مثال کے طور پر کسی قوم، قبیلے یا خاندان کے بہت سے لوگ مل جل کر سعی و محنت کر کے کسی غیر آباد زمین کو آباد کرتے اور کسی بے کار پڑی ہوئی زمین کو کارآمد اور قابل کاشت بناتے ہیں تو اسلامی تصورِ ملکیت کی رو سے وہ زمین ان بہت سے افراد کی اجتماعی ملکیت اور مشترک ملکیت ہوتی ہے اور اس کا فائدہ ان سب آباد کرنے والوں کے لئے مخصوص ہوتا ہے، یا کچھ لوگ مشینی کاشت اور زیادہ پیداوار کی غرض سے اپنے چھوٹے چھوٹے زمینی خطوں کو یکجا جمع کر دیتے اور مجموعی پیداوار میں شریک و حصہ دار بن جاتے ہیں تو اسلام کے مطابق اس قسم کی اجتماعی اور مشترک ملکیت قطعی طور پر جائز ہوتی ہے اور یہ بالکل ایسا ہے جیسے شرکت کے طریقہ پر بہت سے لوگوں کا اپنے اپنے سرمائے کو یکجا کر کے بڑے پیمانہ پر تجارت کرنا، یا مل و کارخانہ قائم کر کے اس کے اندر مل جل کر صنعتی کام و عمل کرنا۔ اس سے ظاہر ہے کہ معاشی ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ بھی پیدا نہیں

ہوتی اور ان لوگوں کے لئے ذرائع پیداوار کی ملکیت بھی محفوظ رہتی ہے جو اشتراک کے ساتھ کام دعمل کرتے ہیں۔ زمین کی شخصی ملکیت سے متعلق یہ جاننا نہایت اہم وضروری ہے کہ زمین کی شخصی ملکیت اپنے بعض کوائف اور احکام کے لحاظ سے ان اشیاء کی شخصی ملکیت کی طرح نہیں جو ذاتی صرف کے لئے مخصوص ہوتی اور جو اپنے اندر صرف مالک کی کسی حاجت وضرورت کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور جن کی افادیت کا دائرہ فرد واحد تک محدود ہوتا ہے، یہ اس لئے کہ زمین خصوصاً زرعی زمین کی افادیت کا دائرہ صرف اس کے مالک یعنی فرد واحد کی حاجت وضرورت تک محدود نہیں ہوتا اور اس کے اندر صرف اپنے مالک ہی کی حاجت وضرورت پورا کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی بلکہ دوسرے بہت سے انسانوں اور جانداروں کی حاجت وضرورت پورا کرنے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے۔ اسی طرح زمین سے جو غلہ وغیرہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے پیدا کرنے میں کاشت کار کی محنت ومشقت کے ساتھ ان قدرتی عوامل کا بھی بڑا دخل اور مؤثر حصہ ہوتا ہے جو قوت نمو، رطوبت، حرارت وبرودت، ہوا، پانی، روشنی، ہائیڈروجن اور آکسیجن وغیرہ کی شکل میں زمین کے اندر اور باہر موجود ہوتے ہیں اور جو کسی ایک انسان کے فائدہ کے لئے نہیں بلکہ بہت سے انسانوں کے فائدہ کے لئے قدرت کے عام عطیہ کی حیثیت رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے کھیتی اگانے اور غلے اور میوے پیدا کرنے کی نسبت اپنی طرف کی اور اس چیز کو سب انسانوں کے لئے اپنا احسان وانعام بتلایا ہے۔ مثلاً سورہ السجدہ میں فرمایا:

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا نَسُوْقُ الْمَآءَ اِلَی	"کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم پانی
الْاَرْضِ الْجُرُزِ فَنُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا	کے بادلوں کو چٹیل وبنجر زمین کی
تَاْكُلُ مِنْهُ اَنْعَامُهُمْ وَ	طرف لے جاتے ہیں پھر اس سے
اَنْفُسُهُمْ اَفَلَا یُبْصِرُوْنَ ۝	کھیتی اگاتے ہیں جس سے ان

کے چوپائے بھی کھاتے ہیں اور وہ خود بھی، تو کیا انہیں سجھائی نہیں دے رہا ہے۔

اور سورۃ الواقعہ میں فرمایا:

اَفَرَءَيْتُمْ مَا تَحْرُثُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ۝	"کیا دیکھا تم نے کہ تم جو زمین میں بوتے ہو اور تخم ریزی کرتے ہو کیا تم اس کھیتی کو اگاتے ہو یا ہم ہیں اگانے والے؟"
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِى الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ	"کیا دیکھتا نہیں کہ اللہ آسمان سے پانی اتارتا ہے۔ پس اس کے چشمے جاری کر دیتا ہے زمین میں، پھر اس سے کھیتیاں اگاتا ہے مختلف رنگوں کی۔"

یہ اور اس مضمون کی دوسری قرآنی آیات جن میں اس حقیقت کا بیان ہے کہ زمینوں سے جو غلّے اور پھل میوے اگتے اور پیدا ہوتے ان کو اللہ تعالیٰ اگاتا اور پیدا کرتا ہے اور سب انسانوں اور جانداروں کے لئے بطور رزق پیدا کرتا ہے، اس پر دلالت کرتی ہیں کہ پیداوار زمین سب انسانوں کے فائدہ کے لئے اور سب کو اس سے مستفید ہونے کا یکساں حق ہے، بالفاظِ دیگر زمین ہر حال میں عامۃ الناس کے فائدہ کے لئے ہے لہٰذا کسی شخص کو خواہ اس کا مالک ہی کیوں نہ ہو اس میں کسی ایسے تصرّف و ردوبدل کا اختیار نہیں ہوتا جو عامۃ الناس کے مفاد سے مطابقت نہ رکھتا بلکہ اس کے منافی ہو۔ مثلاً عامۃ الناس کو گیہوں اور چاول کی ضرورت ہے اور مالک زمین اپنا فائدہ اس میں دیکھتا ہے کہ زمین میں تمباکو اور پوست وغیرہ کاشت کرے یا کماد لگائے تو باوجود مالک ہونے کے اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہوتا اور حکومت اس کو سختی سے روک سکتی ہے یا مثلاً یہ کہ مفاد عام کا تقاضا یہ ہے کہ زمین میں کسی غلّے وغیرہ کی ضرور کاشت کی جائے لیکن اس کا مالک اپنی مصلحت اس میں دیکھتا ہے کہ اسے بلا کاشت کے چھوڑ دے تو چونکہ اس کا ایسا کرنا مفاد عامہ اور مصلحت عامہ کے خلاف و منافی ہے تو حکومت مالک کو مجبور کر سکتی ہے کہ وہ اس زمین کو کاشت کرے۔ غرضیکہ زمین کی نجی ملکیت، اشیاء صرف و استعمال کی نجی ملکیت سے مختلف

ہے کیونکہ اشیائے صرف کے صحیح استعمال سے فائدہ بھی صرف ان کے مالک کو پہنچتا ہے اور غلط استعمال سے نقصان وضرر بھی ان کے مالک کو پہنچتا ہے دوسرے انسانوں کو نہ ان کے صحیح استعمال سے فائدہ اور نہ غلط استعمال سے ضرر پہنچتا ہے۔ لہٰذا اگر چہ غلط استعمال پر ان کا مالک شرعاً گنہگار ٹھہرتا ہے۔ اس لئے کہ مال کو غلط طریقہ سے استعمال اور ضائع کرنا شرعاً ممنوع ہے لیکن حکومت اس پر نہ کوئی قانونی پابندی لگا سکتی ہے اور نہ سختی کے ساتھ اسے روک سکتی ہے جبکہ برخلاف زمین کا حال یہ ہے کہ اس کے صحیح استعمال سے مالک کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی فائدہ پہنچتا ہے۔ اسی طرح اس کے غلط استعمال سے جو نقصان ظہور میں آتا ہے اس سے مالک کے ساتھ ساتھ کچھ دوسرے لوگ بھی ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا زمین کے غلط اور نقصان دہ استعمال پر حکومت پابندی لگا سکتی اور مالک کو زبردستی روک سکتی ہے۔

ملکیت زمین کی تحدید

ملکیت زمین کی بحث میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسلام ملکیت زمین میں تحدید کا قائل ہے یا قائل نہیں؟ یعنی کیا وہ اس بارے میں کوئی ایسی پابندی لگاتا اور تحدید عائد کرتا ہے کہ ایک شخص کی ملکیت میں زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ اور اتنے بیگھے زمین ہونی چاہئے یا وہ کوئی ایسی تحدید و پابندی عائد نہیں کرتا اور آزاد چھوڑ دیتا ہے جتنی کوئی چاہے حاصل کرلے؟

اس بارے میں جہاں تک میرے مطالعے اور میری تحقیق و جستجو کا تعلق ہے مجھے قرآن و حدیث میں ایسی کوئی نص نہیں ملی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ ایک شخص کی ملکیت میں زیادہ سے زیادہ صرف اتنے ایکڑ اور کنال زمین ہو سکتی ہے اس سے زائد نہیں ہو سکتی۔ پھر جب قرآن و حدیث میں دوسرے کسی مال کی ملکیت کے متعلق کوئی تحدید نہیں نہ دراہم و دنانیر کے متعلق اور نہ جانوروں و مویشیوں سے متعلق، تو زمین کے متعلق مساحت و پیمائش کے لحاظ سے کوئی تعیین و تحدید نہ ہونا کوئی خلاف قیاس بات نہیں۔ البتہ زمین کے متعلق جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا قرآن کریم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عامۃ الناس

کے فائدے اور مفاد عام کے لئے ہے اور مفاد خاص اس کے تابع ہے۔ لہٰذا اگر کہیں مفاد عامہ کا یہ تقاضا ہو کہ زمینوں کی شخصی و نجی ملکیت کی تحدید کر دی جائے تو اہل الرائے کے مشورے سے کی جا سکتی ہے، مثلاً اگر کسی ملک میں زمین کی ملکیتوں کا نظام ایسا ہے جو ملک کی ضرورت کے مطابق مطلوبہ غذائی پیداوار کی راہ میں رکاوٹ ہے اور رکاوٹ کا سبب یہ ہے کہ بعض لوگوں کے پاس اتنی زیادہ زمینیں ہیں جن کو صحیح طور پر کاشت کرنا ان کی طاقت سے باہر ہے لہٰذا ان کی زمینوں کا ایک خاصا حصہ صحیح کاشت نہ ہونے کی وجہ سے بیکار ضائع ہو جاتا ہے اور دوسری طرف بعض کاشت کاروں کے پاس اتنی کم زمینیں ہیں جو ان کی نصف قوتِ کار سے کاشت ہو جاتی ہیں اور ان کی نصف قوت کار فضول ضائع ہو جاتی ہے اس کا نتیجہ غذائی پیداوار کی کمی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے تو ایسی صورت میں اسلامی حکومت عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلی قسم کے لوگوں کی ملکیت زمین کا دائرہ تنگ اور دوسرے لوگوں کی زمین کا دائرہ وسیع کر سکتی ہے جس سے غذائی پیداوار میں اضافہ ہو سکتا اور لوگوں کی غذائی ضرورتیں بہتر طور پر پوری ہو سکتی ہوں۔ مطلب یہ کہ اجتماعی مفاد کے لئے ضروری ہو تو نمائندہ حکومت زمین کے متعلق افراد و اشخاص کی ملکیت کی تحدید کر سکتی ہے اور عدل کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کا مطلب یہ کہ جن لوگوں سے زائد زمین لی جائے اگر وہ اسلامی اصولوں کے مطابق اس زمین کے صحیح مالک ہوں تو انہیں رواج کے مطابق اس کا معاوضہ دیا جائے اور اگر وہ صحیح مالک نہ ہوں جیسا کہ عام طور پر ہے تو ان کو کوئی معاوضہ نہ دیا جائے۔

زمین کے متعلق بعض احادیثِ نبویہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا منشائے نبوت یہ ہے کہ زرعی زمین اس کے پاس ہو جو اسے کاشت کر سکتا ہو اور اتنی ہو جتنی وہ کاشت کر سکتا ہو، ایسی احادیث نبویہ سے میری مراد وہ احادیث ہیں جن میں مالک زمین کے لئے واضح اور دو ٹوک ہدایت ہے کہ وہ اپنی زمین خود کاشت کرے۔ اگر خود کاشت نہ کر سکتا ہو تو دوسرے ضرورت مند کو بلا معاوضہ مفت کاشت کے لئے دے دے، نہ بٹائی پر دے اور نہ ٹھیکہ اجارہ پر۔ ظاہر ہے کہ اگر اس طرح کی احادیث پر پوری طرح عمل ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمین

خود کاشتی کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس فیصلے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے جو انہوں نے اپنے عہد خلافت میں حضرت بلال بن حارث المزنی کے معاملہ میں صادر فرمایا جس کا پیچھے قدرے تفصیل کے ساتھ ذکر ہو چکا۔ آپ نے فرمایا جتنی زمین آپ کاشت کر سکتے ہیں رکھ لیجئے اور بقیہ دے دیجئے کہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دی جائے۔

گذشتہ صفحات میں زرعی زمین کی نجی و شخصی ملکیت کے مسئلہ سے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے بخوبی یہ واضح اور اچھی طرح آشکارا ہو جاتا ہے کہ اسلام اپنے تصور نجی ملکیت کے تحت دوسری اشیاء کی طرح زمین کی نجی و شخصی ملکیت کو بھی جائز تسلیم کرتا اور اپنے معاشی نظام میں اسے قائم رکھتا اور تحفظ دیتا ہے اور چونکہ زمین ذرائع پیداوار میں سے ہے لہٰذا اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام ذرائع پیداوار کی شخصی و نجی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے اور درحقیقت یہی وہ چیز ہے جو اسلام کے معاشی نظام کو اشتراکی معاشی نظام سے بنیادی طور پر جدا اور الگ کر دیتی ہے کیونکہ اشتراکی معاشی نظام اگرچہ اشیاء صرف اور ذاتی استعمال کی چیزوں کے متعلق افراد و اشخاص کی انفرادی اور شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا اور قانونی تحفظ دیتا ہے لیکن ذرائع پیداوار اور وسائل آمدنی کی نجی اور شخصی ملکیت کا قطعی طور پر انکار کرتا ہے اور ان کو صرف اجتماعی قرار دیتا ہے۔ البتہ اس پہلو سے اسلام کا معاشی نظام، سرمایہ داری نظام کے ضرور مشابہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ داری نظام بھی ذرائع پیداوار کی شخصی و نجی ملکیت کو پورے شد و مد کے ساتھ مانتا اور اسے اپنی بنیادی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت بتلاتا ہے، لیکن چونکہ اسلام کسی سرمائے کو عامل پیداوار نہیں بلکہ صرف انسانی محنت کو خواہ وہ دماغی ہو یا جسمانی، عامل پیدائش دولت تسلیم کرتا ہے۔ لہٰذا اس کی وجہ سے اسلامی معاشی نظام سرمایہ دارانہ معاشی نظام سے بنیادی طور پر جدا اور علیحدہ ہو جاتا ہے گو وہ اس پہلو سے نظام اشتراکیت سے جزوی طور پر مشابہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اس میں حرج کی کوئی بات نہیں کیونکہ من حیث الکل اور بحیثیت مجموعی نہ وہ نظام سرمایہ داری ہے اور نہ نظام اشتراکیت۔

(بقیہ باقی صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے)

اِن شاءَ اللہ العزیز ——— اس سال بھی

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام

مُحاضراتِ قرآنی

یکم اپریل (جمعہ) تا ۵ - اپریل (منگل) ۱۹۸۳ء

(شام کے اوقات میں)

جناح ہال (ٹاؤن ہال) لاہور میں منعقد ہونگے

جن میں

پاکستان کے ممتاز علماء دین اور دانشور حضرات کے علاوہ

بھارت سے مولانا **وحید الدّین خان** صاحب (مدیر الرسالہ دہلی)

پروفیسر **محمّد اقبال انصاری** صاحب (صدر شعبۂ اسلامیات، علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی) شرکت فرمائیں گے۔ بھارت سے مزید اہل علم حضرات کی آمد کی بھی توقع ہے۔

شرکت کی عام دعوت ہے

اہل علم سے شرکت کی خصوصی استدعا ہے،
خواتین کیلئے پردہ کا انتظام ہوگا

المعلن :- ناظم اعلیٰ، مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

Regd. L. No. 8193

'HIKMAT-E-QURAN' MONTHLY LAHORE

Vol. I | FEBRUARY 1983 | No. 12

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ۝

Games should act as an incentive to all Pakistan Nationals to emulate the Olympic Motto

Faster Higher and Stronger

Quaid-e-Azam April 12, 1948

Karachi Port
Gateway to Pakistan